بسم اللہ الرحمن الرحیم

السیرۃ النبویۃ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

تحقیقی وتوقیتی مطالعہ: مکی دور

سولہویں قسط

پروفیسر ظفر احمد

Abstract
Al-Serrat-al-Nabawia:
Analytical to chronological study

It is the 16th part of a long chain of articles. The life pattern of the Holy Prophet (ﷺ) both in theory and practice was in strict accordance with the Holy Quran, the miraculous word of ALLAH. In this treatise the writer has scholarly elaborated the wonderful brevity of the Holy Quran and its highly commendable logical approach towards the strikingly successful annihilation of the false and deceitful theories and doctrines of the kufr (disbelief) and the Shirk (polytheism) along with the related aberrations from the right path. He has particularly stressed upon the method of Tashqeeq-i-Jadali (point wise analysis of the concerned debatable issues) under the Quraine guidance.

چھٹا شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ جن وانس کو ہی عبادت کے لئے کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس شبہے کا جواب بھی سورۂ فاتحہ کی ابتدائی آیات میں مضمر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ہی تمام کمالات کا حقیقی مالک ہے، وہی حقیقی محسن اور وہی انصاف کے دن کا مالک ہے تو اللہ تعالیٰ کے ان اوصاف کی صحیح معرفت عقل کے بغیر نہیں

ہوسکتی۔ جن وانس ذی عقل (عقل رکھنے والی) مخلوق ہیں، لہٰذا وہی عبادت کے مکلّف و پابند ٹھہرائے گئے ہیں۔ نیز دیکھئے کہ ہماری اولیں ضرورت ہوا ہے۔ اس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے یعنی ہوا ہمارے لئے ہے ہم ہوا کے لئے نہیں ہیں۔ ہم سے پہلے بھی ہوائیں چلتی تھیں اور ہمارے مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہماری دوسری اہم ضرورت پانی ہے۔ اس کے بغیر بھی ہم زندہ نہیں رہ سکتے، یعنی پانی ہمارے لئے ہے ہم پانی کے لئے نہیں ہیں۔ ہم سے پہلے بھی بارشیں ہوتی تھیں، دریا اور سمندر موج زن تھے۔ ہمارے مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اسی طرح نباتات، حیوانات اور جمادات ہمارے لئے ناگزیر ہیں لیکن ہم ان کے لئے ناگزیر نہیں ہیں۔ جب یہ سب کچھ ہمارے لئے پیدا کیا گیا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ کے لئے پیدا کیے گئے ہیں سورہ بقرہ میں ہے کہ (اللہ) وہی ہے جس نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ (۱/الف) سورۃ الذاریات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے جنات اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (۱/ب)

ساتواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ اگر زندگی کا مقصد عبادت ہے تو عبادت کے طریقے عقل سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ اس کا جواب سورہ فاتحہ میں **اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم،** کے کلمات سے یوں دیا گیا (کہ تم اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کرو کہ) ہمیں سیدھے راستے پر چلا دے جو ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر تیرا (اس صراط مستقیم والا خاص) انعام ہوا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ دیگر صلاحیتوں اور قوتوں کی طرح عقل کا دائرۂ کار بھی محدود ہے۔ غور کیجئے کہ اگر آنکھیں بصارت کا کام دیتی ہیں تو عقل بصیرت (اپنے نفع ونقصان میں امتیاز) کا کام دیتی ہے۔ صحیح بصارت کے لئے جہاں آنکھوں کا بذاتِ خود صحت مند ہونا ضروری ہے وہیں باہر کی روشنی بھی ہونی چاہئے۔ تاریکی میں آنکھیں بصارت کا کام نہیں دیں گی۔ اسی طرح صحیح بصیرت کے لئے جہاں عقل ودماغ کا صحیح ہونا ضروری ہے تو وہیں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا علیہم السلام پر نازل ہونے والی وحی کے نور کی بھی ضرورت ہے۔ عقل اگرچہ بہت بڑی نعمت ہے لیکن وحی کی راہ نمائی کے بغیر یہ تمام مسائل حل نہیں کرسکتی۔ بے شک مادی سائنسی علوم میں عقل کا بہترین کردار ہے۔ مسلسل تجربہ ومشاہدہ اور متعلقہ علوم وفنون کا تاریخی سرمایہ عقل کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس کائنات کے اسرار کو سمجھے اور قوانینِ فطرت کو اپنی سہولت اور فائدے کے لئے استعمال میں لائے لیکن جن وانس کی زندگی کے پانچ شعبے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق ایسے شعبے ہیں جہاں عقلیں متفقہ فیصلہ دینے سے قاصر ہیں۔ کوئی توحید کا داعی ہے تو کوئی شرک پر کاربند ہے۔ کوئی خدا کا قائل ہے تو کوئی دہریت کا دم بھرتا ہے، کوئی (مثلاً) خنزیر کو سخت نجس اور اس کے گوشت کو حرام قرار دیتا ہے تو کوئی

بڑے شوق اور رغبت سے اسے کھاتا ہے، کوئی گائے کو مقدس خیال کرتا ہے تو کوئی اسے اپنی خوراک بنالیتا ہے اور اس کا گوشت مزے سے کھاتا ہے۔ کوئی مکر وفریب اور جھوٹ کو سخت مذموم قرار دیتا ہے تو کوئی نام نہاد نظریہ قومیت اور کبھی نام نہاد نظریہ ضرورت کے تحت قومی مقاصد اور مفادات کی آڑ میں اسے بالکل جائز گردانتا ہے۔ پھر سب لوگوں کی عقلیں بھی ایک ہی مرتبے کی نہیں ہوتیں۔ نیز عقل سے بسا اوقات جذباتی فیصلے بھی صادر ہوتے ہیں لہٰذا عقل کو وحی کے سہارے کی بھی شدید ضرورت ہے۔ اسی لئے سورہ فاتحہ میں اشارہ کردیا گیا ہے کہ تم صرف اپنی عقل سے منزل کو نہیں پاسکتے۔ اس کے لئے تمہیں اللہ کے ان بندوں کی راہ اپنانی ہوگی جن کو اللہ تعالیٰ نے سیدھے راستے پر چلنے کے خاص انعام سے نوازا ہے۔

آٹھواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ جب عقل بہت بڑی نعمت ہونے کے باوجود سارے مسائل کا حل نہیں اور اس سے کام لینے میں خطا اور غلطی کا صرف امکان ہی نہیں بل کہ یقین بھی ہے ورنہ دنیا میں مختلف مذاہب اور مسالک نہ ہوتے، اس لئے ہم تو صرف اسی کی اتباع کریں گے جو ہر طرح کی غلطی سے محفوظ و مامون ہو یعنی معصوم عن الخطا ہو۔ اسی لئے عیسائیوں کے رومن کیتھولک چرچ میں پاپاؤں کو ناحق معصوم عن الخطا قرار دیا گیا، حال آں کہ یہ معصوم تو کیا ہوتے ان میں سے اکثر اس لائق بھی نہ تھے کہ انہیں ایک عام شریف انسان ہی سمجھا جاسکے۔ ان ہی کے سیاہ کارناموں، مخالفین پر بیجا ظلم وتشدد، ان کو زندہ جلا دینے کی ظالمانہ سزاؤں کے ردعمل میں پروٹسٹنٹ چرچ وجود میں آیا۔ اس شبہے کے جواب میں سورہ فاتحہ میں یہ بتایا گیا کہ تمہیں مُنعَم علیھم (انعام یافتہ) لوگوں کے راستے پر چلنا ہوگا۔ سورہ فاتحہ باقی ماندہ پورے قرآن کا خلاصہ اور مقدمہ ہے اور اسی لئے اسے امّ القرآن کہا جاتا ہے۔ سورہ نساء میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ لوگوں سے مراد انبیا، صدیقین، شہدا، اور صالحین ہیں (ا/ ج)، نبی وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے لہٰذا اگر بشری تقاضے کے تحت اس سے کبھی کبھار اور شاذ ونادر کوئی فکری غلطی (خطائے اجتہادی) ہو یا وہ بھول جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے یا کسی بھی ذریعے سے یقیناً نہ صرف نبی کو اطلاع بل کہ غلطی کی اصلاح بھی کردی جاتی ہے، یعنی انبیا علیہم السلام معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ لیکن انعام یافتہ لوگوں کے باقی تینوں گروہ صدیقین، شہدا اور صالحین چوں کہ صاحب وحی نہیں لہٰذا وہ معصوم عن الخطا نہیں ہیں۔ لیکن جہاں معصوم عن الخطا انبیا علیہم السلام کا راستہ مطلوب ہے وہیں غیر معصوم صدیقین، شہدا اور صالحین کا راستہ بھی مطوب ومقصود ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کی تعلیم سے جو باتیں لوگوں کو یقینی طور پر معلوم ہوگئیں، مثلاً اسلام یقیناً حق ہے اور کفر یقیناً باطل ہے، توحید یقیناً حق ہے اور شرک یقیناً باطل ہے، سنت یقیناً حق ہے اور بدعت یقیناً باطل ہے اور مثلاً شریعتِ محمدیہؐ میں نماز،

روزے، زکوٰۃ اور حج کا فرض ہونا یقینی اور قطعی طریقے سے ثابت ہے اور مثلاً سود اور خنزیر وغیرہ کا حرام ہونا بھی یقینی اور قطعی ذرائع سے ثابت ہے تو یقینی وقطعی مسائل میں خواہ ان کا تعلق عقائد سے ہو یا دین کے دیگر شعبوں سے ہو، رہنمائی کے لئے لوگوں کو کسی معصوم عن الخطا کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اور جن مسائل میں صحیح وغلط، اعلیٰ وادنیٰ، افضل ومفضول، راجح ومرجوح کا سو فیصد یقینی فیصلہ ممکن نہ ہو ان میں غور وفکر اور اجتہاد واستنباط کی صلاحیت رکھنے والے اہل علم غور وفکر سے فیصلہ صادر کریں گے۔

ایسے مسائل کو اجتہادی مسائل کہا جاتا ہے۔ چوں کہ سب کی عقلی صلاحیتیں یک ساں نہیں لہٰذا ان مسائل میں خطا کا اگر وقوع (Occurence) نہ بھی ہو تو بھی احتمال تو ضرور موجود ہے لیکن اس پریشانی کا ازالہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمادیا کہ ''لوگوں کو یہ دعا سکھادی کہ اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے تو ہمارا مواخذہ نہ فرمانا'' (۲/ الف) ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو یہ دعا سکھائے پھر اجتہاد کے اہل مجتہدین کا ان کے خطا ونسیان پر مواخذہ بھی کرے۔ جب مجتہد اہل علم کی خطا معاف ہے تو عام لوگ جو اجتہاد اور غور وفکر کے بلند مقام تک پہنچ نہیں سکتے یا جن اجتہادی مسائل میں مجتہدین فیصلہ کر چکے ہیں ان میں مزید کسی اجتہاد کی قطعاً ضرورت ہی نہیں تو مجتہدین کے ایسے مُقلدین اور پیروکاروں پر بھی قطعاً کوئی الزام نہ آئے گا۔ لہٰذا پیغمبر کے بعد اجتہادی مسائل میں بھی کسی معصوم کی ضرورت نہ رہی ورنہ وہ معصوم کی اتباع کے بہر حال پابند ہوتے۔ اسی لئے سورہ فاتحہ میں صراط مستقیم کی یہ تعبیر نہیں کی گئی کہ یہ اللہ کا راستہ ہے یا یہ اللہ کے رسول کا راستہ ہے، حال آں کہ قرآن کریم میں یہ تعبیرات وتشریحات بھی موجود ہیں مثلاً سورہ انعام اور سورہ حج میں صراط مستقیم کو اللہ کا راستہ قرار دیا گیا ہے اور مثلاً سورہ شوریٰ اور سورہ نور میں رسول کے راستے کو صراط مستقیم کہا گیا ہے۔ (۲/ ب) لیکن سورہ فاتحہ میں صراط مستقیم کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ یہ **منعم علیھم** (انعام یافتہ) لوگوں کا راستہ ہے۔ بالفاظ دیگر صدیقین، شہدا اور صالحین کا راستہ ان کے غیر معصوم ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نزدیک بعینہٖ وہی راستہ ہے جو رسول کا راستہ ہے، جسے کبھی اللہ کا راستہ بھی کہا جاتا ہے۔ الفاظ وکلمات کے ظاہری اختلاف کے باوجود مفہوم ایک ہی ہے یعنی یہ حقیقی اختلاف وتضاد نہیں ہے۔ غیر معصوم مجتہدین کو غور وفکر اور اجتہاد واستنباط کی دعوت اس لئے دی گئی کہ عقل کے دائرہ کار کے بارے میں لوگ افراط وتفریط کی بہ جائے اعتدال ومیانہ روی سے کام لیں۔ نہ تو عقل کو اتنی چھٹی دی جائے کہ وحی کی ضرورت سے ہی انکار کر دیا جائے یا رسول ونبی کی تعلیم سے جن مسائل میں یقین حاصل ہو چکا ہے، ان میں عقل کو خواہ مخواہ داخل کر کے ان کی مخالفت کی جائے اور غیر اسلامی رسوم وثقافت کو ناحق مشرف بہ اسلام کرنے میں اپنی عقلی صلاحیتیں

اور وقت صرف کیا جائے اور نہ ہی عقل کو اس قدر پابند کر دیا جائے کہ دین میں ایسے مسائل ہی نہ رکھے جائیں یا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیدا نہ کئے جائیں جن میں عقل کو بھی غور وفکر کے مواقع فراہم ہوسکیں۔ چناں چہ سورہ النحل میں ہے وانزلنا اھلیك الذکر لتبین للناس مانزل الیھم ولعلھم یتفکرون۔ (۲/ج) ''ہم نے تیری طرف (قرآن کریم کی صورت میں) نصیحت اتاری ہے تاکہ تو لوگوں کو خوب کھول کر سمجھائے اور تاکہ وہ (خود بھی اجتہادی مسائل میں) خوب غور وفکر کریں۔'' دیکھئے جن مسائل کی تبیین وتشریح اللہ کا رسول کر دے ان میں تو غور وفکر کی حاجت ہی نہ رہی اس لئے آیت میں حرف عطف ''واؤ'' لایا گیا جو مغائرت یعنی ایک علیحدہ بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ جن مسائل کی اللہ تعالیٰ نے جان بوجھ کر اپنے رسول سے مکمل یا جزوی تبیین وتشریح نہیں کرائی بل کہ انہیں مبہم رکھا اور مستقبل میں پیش آنے والے نئے مسائل کو بھی بالکل مخفی رکھا، ان میں اجتہاد کی صلاحیت کے حامل اہل علم غور وفکر اور اجتہاد و استنباط سے کام لیں۔ اجتہادی صلاحیت ایک وہبی نعمت ہے جو ہر عالم کو حاصل نہیں ہوتی چناں چہ سورہ نساء میں ہے کہ جب ان لوگوں کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو وہ اسے مشہور کر دیتے ہیں ولو ردوہ الی الرسول والیٰ اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنطونہ منھم (۳/الف) ''اور اگر وہ ایسی خبر کو رسول اور اولوالامر کے پاس پہنچاتے تو جو استنباط (غور وفکر کر کے تحقیق) کرنے والے ہیں تو وہ تحقیق کر لیتے'' دیکھئے یہاں رسول کی موجودگی میں رسول کے ساتھ اولوا الامر (علما اور حکام) اور ان اولوا الامر میں سے اجتہاد واستنباط کی صلاحیت رکھنے والوں کا بھی ذکر ہے۔ یعنی دینی مسائل میں رسول کی اطاعت واتباع تو مطلوب ومقصود ہے ہی، ساتھ ہی اجتہادی مسائل میں اہل علم کی بھی اتباع ہوگی جو درجہ اجتہاد واستنباط کو پہنچے ہوئے ہوں۔ یہاں اولوالامور سے اگر اہل علم کی بہ جائے حکام مراد لئے جائیں تو بھی اسلامی ریاست میں حکام شریعت کے مطابق احکام جاری کرنے کے پابند ہوتے ہیں اگر وہ خود عالم نہ ہوں تو لازماً انہیں علما سے ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ آیت مذکورہ کے کلمات یستنطبتونہ منھم میں ''من'' تبعیضیہ ہے یعنی یہ ظاہر کر رہا ہے کہ سب اہل علم اجتہاد کے اہل نہیں ہوا کرتے، بل کہ ان میں سے بعض کو ہی یہ درجہ حاصل ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کے متعلق فقیہ اور غیر فقیہ کی تقسیم جو اہل علم نے کی ہے، وہ کتاب اللہ کے عین مطابق ہے، کیوں کہ زیر بحث آیت کے اولیں مخاطب صحابہ کرامؓ ہی تو ہیں۔ پس اجتہادی مسائل میں غیر مجتہد علما اور عوام کو غیر معصوم مجتہدین کی بھی اتباع کرنا ہوگی۔ چناں چہ صراط الذین انعمت علیھم کے کلمات نے اس سلسلے میں تمام متعلقہ شبہات کی جڑ کاٹ دی ہے۔

نواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ زن، زر، زمین وغیرہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں تو سورہ فاتحہ میں کون

سے انعام کی بات کی گئی ہے؟ اس شبہے کا جواب اھدنا الصراط المستقیم میں صراطِ مستقیم کے کلمات میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس دنیا میں کچھ نعمتیں تو وہ ہیں جو اس نے اپنے دوست و دشمن، موافق ومخالف، مومن وکافر، صالح وفاجر ہر کسی کو دے رکھی ہیں لیکن صراط مستقیم کی نعمت اس نے صرف اور صرف اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی عطا فرمائی ہے۔ ان پسندیدہ بندوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ بندے وہ ہیں جنہیں اسی سورہ فاتحہ میں مغضوب علیھم (جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا) اور ضالین (صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے گم راہ) کہا گیا ہے۔ اللہ کے غضب میں مبتلا وہ لوگ ہیں جو صراط مستقیم کو پہچان لینے کے باوجود اس پر گام زن ہونا تو درکنار اسے قبول تک کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور گم راہ وہ لوگ ہیں جو جہالت کی بنا پر فکری لغزشوں میں مبتلا اور سیدھے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ غور وفکر کر کے سیدھا راستہ معلوم کرنے اور فکری لغزشوں سے نجات پانے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ وہ عموماً آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور برادری کے طور طریقوں کی سوچے سمجھے بغیر پیروی کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔

دسواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ ہماری عبادت کا محتاج ہے؟ اس کا جواب سورہ فاتحہ کے کلمات رب العالمین میں ہی موجود ہے۔ جب اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا پروردگار ہے تو مخلوقات سب کی سب اس کی محتاج ہیں لیکن وہ کسی کا محتاج نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا جن وانس کے اپنے ہی مفاد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو قطعاً اس کی ضرورت نہیں، چناں چہ سورہ بقرہ میں ہے کہ اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں بھی اور جو تم سے پہلے (لوگ گزر چکے) انہیں بھی پیدا کیا تا کہ تم (اس عبادت کے ذریعہ اللہ کے عذاب سے) بچ جاؤ'' (۲/ب) کوئی عقل مند شخص قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی نہیں کرتا تا کہ نقصان سے بچا رہے۔ مثلاً کوئی عقل مند شخص آگ میں اپنا ہاتھ نہیں ڈالے گا تا کہ وہ جلنے سے بچ جائے۔ وہ بہت اونچی جگہ سے چھلانگ لگانے سے پرہیز کرے گا تا کہ نیچے گر کر مرنے یا زخمی ہونے سے بچ سکے۔ کوئی عقل مند شخص تھوڑا تھوڑا کر کے بھی کوئی زہر استعمال نہیں کرے گا جو بالآخر اس کی (طبی اصطلاح کے مطابق) غیر طبعی موت کا سبب بنے۔ وہ ایسی آہستہ آہستہ زہر خورانی Slow poisoining سے اپنی جان کی خاطر پرہیز کر کے کسی اور پر نہیں بل کہ اپنی جان پر ہی احسان کرے گا۔ بعینہٖ اسی طرح عقل مند شخص قوانین فطرت کی طرح قوانین شریعت کی پابندی (عبادت) بھی محض اپنے مفاد میں کرے گا۔ اللہ پر یا کسی اور پر احسان نہیں کرے گا چناں چہ (مثلاً) سورہ فرقان میں ہے کہ اگر تم (اپنے رب کو) نہیں پکارو گے تو تمہارے رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں۔ تم نے (اپنے رب کو اور اس کی باتوں کو اگر) جھٹلایا ہے تو عن قریب (قانون شریعت کی اس خلاف ورزی پر) اس کی سزا تمہیں چمٹ جانے والی ہوگی

(۳/ ج) اور مثلاً سورہ حٰم سجدہ میں ہے کہ جو شخص نیک کام کرے گا تو اپنے فائدے کے لئے کرے گا اور جو شخص برا کام کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا اور تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ (۴/ الف)

گیارہواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ جب جن وانس کی زندگی کا مقصد عبادت ہے تو عبادت کے ساتھ معاملات، معاشرت اور اخلاق کو کیوں شامل کیا گیا ہے؟ عبادت تو محض پوجا پاٹ کا نام ہے۔ اس کا جواب سورہ فاتحہ میں لفظ "نستعین" میں مضمر ہے۔ ساتویں شبہے کے جواب میں بتایا جاچکا ہے کہ عقل بڑی نعمت ہے لیکن اس کا دائرۂ عمل بہ ہر حال محدود ہے۔ جن مسائل میں عقل کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنے سے قاصر ہو، وہاں ہمیں اللہ سے مدد مانگنی پڑتی ہے یعنی وحی کی رہنمائی کے بغیر ان مسائل کا صحیح حل معلوم کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ چناں چہ معاملات، معاشرت اور اخلاق سے تعلق رکھنے والے بہت سے امور میں ہمیں حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ راہ نمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز، زکوٰۃ روزے اور حج پر لفظ عبادت کا اطلاق ایک خاص اصطلاحی معنی کے اعتبار سے ہے، تاکہ دین کے دوسرے شعبوں سے ان کا امتیاز ہوسکے، ورنہ عبادت کے وسیع تر مفہوم میں خاص عبادات نماز، زکوٰۃ روزے اور حج کے علاوہ باقی شعبوں میں بھی اللہ تعالیٰ کا مکمل فرماں برداری عبادت میں ہی داخل ہے۔ عبادت کا معنی لفظ اسلام کی طرح اطاعت وفرماں برداری کا بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں نماز روزہ وغیرہ خاص عبادات کا ہی حکم نہیں بل کہ معاملات اور معاشرتی امور میں بہت سے مسائل مثلاً نکاح وطلاق، خرید وفروخت، حلال وحرام، اخلاق حسنہ وسیۂ کے متعلق تعلیم بھی ملتی ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے کہ "اے لوگو! تم اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ (یعنی دین کے تمام شعبوں میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو) اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ (۴/ ب)

بارہواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سرے سے کائنات کو یا کائنات میں جن وانس کو پیدا ہی نہ کرتا تاکہ ثواب وعذاب کے اس پورے سلسلے سے ہی گلو خلاصی ہوجاتی۔ اس طرح کے تمام شبہات کا جواب بھی کلمات "الحمدللہ" میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قابل تعریف کمالات میں صاحبِ حکمت (حکیم) ہونا بھی شامل ہے۔ جس چیز کا ہمیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔ بہت سی چیزیں اگر کچھ لوگوں کے علم سے بالاتر ہوسکتی ہیں تو کچھ ایسی چیزیں بھی ہوسکتی ہیں جو سب لوگوں کی عقل کی رسائی سے باہر ہوں۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں ہے کہ "(اے پیغمبر!) لوگ تجھ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ تو کہہ دے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے" (۴/ ج) اور مثلاً اسی سورۃ میں ہے کہ "جس چیز کا تجھے علم نہ ہو تو (بغیر تحقیق کے اور جہاں تحقیق ممکن نہ ہو) اس کے پیچھے نہ پڑ جایا کر۔

بے شک کان، آنکھ اور دل (سب سے ضرور) باز پرس ہوگی''۔ (۵/ الف)

تیرہواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ سورہ بقرہ میں ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، (ان میں سے) جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ان پر نہ تو (حقیقت میں بدل جانے والا) خوف ہوگا اور نہ ہی وہ رنجیدہ ہوں گے (۵/ ب) یہی مضمون سورہ مائدہ میں بھی ہے (۵/ ج) اس سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُخروی نجات کے لئے رسالت محمدؐیہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے بل کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ نجات کے لئے کافی ہیں۔ اپنے اس باطل تصور کو وہ نظریۂ وحدتِ ادیان کا نام دیتے ہیں۔ اس شبہے کا جواب بھی سورہ فاتحہ کے کلمات صراط الذین انعمت علیھم میں مضمر ہے۔ مُنعم علیھم (انعام یافتہ) لوگوں کا اولین'' طبقہ حضرات انبیا علیہم السلام کا ہے۔ رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سید الانبیا وخاتم الانبیا ہیں۔ جب ان کا راستہ صراط مستقیم ہے جو سب ہی کو مطلوب ہے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی اتباع کے بغیر صراط مستقیم پر گام زن ہونا اور اُخروی نجات پالینا ممکن نہیں۔ نظریۂ وحدتِ ادیان ایک سنگین فکری لغزش ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور توجہ طلب ہیں۔

(الف) اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو تو مانتا ہوں لیکن اس کے فلاں رسول یا اس کی فلاں کتاب کو نہیں مانتا تو ایسا شخص عقلِ سلیم کے بدیہی فیصلے کے مطابق اللہ پر اپنے ایمان کے دعوے میں سراسر جھوٹا ہے، گو وہ بزعمِ خویش اپنے ایسے ایمان کو صحیح سمجھتا ہو۔ قرآن کریم کی تعلیم عقلِ سلیم کے خلاف ہرگز نہیں ہوا کرتی۔ سورہ نساء میں ہے کہ'' بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض نبیوں کو تو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کی کوئی راہ نکالیں، یہ لوگ پکے کافر ہیں اور ہم نے ایسے کافروں کے لئے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے تمام پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔ (۶/ الف) اور اسی سورہ نساء میں ہے کہ'' اے ایمان والو! اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کتاب (قرآن کریم) پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری اور ان کتابوں پر بھی جو اس نے پہلے اتاری ہیں۔ اور جو شخص بھی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں اور آخرت کے دن کا انکار کرے گا وہ دور کی گم راہی میں جا پڑا''۔ (۶/ ب) سورہ بقرہ میں ہے کہ'' اصل نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور

(اللہ کی) کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے'' (۶/ ج) اور اسی سورہ بقرہ میں اہل کتاب کو اسلام قبول کرنے کی دعوت یوں دی گئی ہے کہ ''(اے مسلمانو!) تم یہ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو ہماری طرف (وحی کے ذریعے) اتارا گیا اس پر، اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتارا گیا اس پر، اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور (دوسرے) نبیوں کو دیا گیا اس پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ ہم ان نبیوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں) اور ہم اس (اللہ) کے لئے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔ تو اگر وہ (اہل کتاب) بھی ایسے ہی ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ سیدھی راہ پا گئے اور اگر وہ منہ پھیریں تو وہ (ناحق ضد اور) مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں۔ (اے پیغمبر!) اللہ تیرے لئے ان کے مقابلے میں کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے'' (۷/ الف) سورہ محمد میں ہے کہ ''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور اس (وحی) پر ایمان لائے جو محمد پر اتاری گئی اور بات بھی یہ ہے کہ وہی ان کے رب کی طرف سے حق (سچا دین) ہے، ان کے گناہ اس (اللہ) نے دور کر دیئے اور ان کے حال کی اصلاح کر دی اور یہ اس لئے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی اور مومنوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی۔ اسی طرح لوگوں کو اللہ ان کے احوال بتاتا ہے'' (۷/ ب) ان تمام قرآنی مضامین سے خوب واضح ہے کہ جو خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا اللہ کے کسی بھی پیغمبر کا انکار کرے اس کا اللہ پر ایمان کا دعویٰ مردود اور نا قابل قبول ہے۔ ایسا شخص پکا کافر ہے۔

(ب) قرآن کریم میں بارہا یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو کفر پر مرجائے ہرگز اس کی نجات نہیں ہوگی، مثلاً سورہ بقرہ میں ہے کہ ''بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں ڈھیل دی جائے گی'' (۷/ ج) اور مثلاً سورہ محمد میں ہے کہ ''جو لوگ کافر ہوئے اور اللہ کی راہ سے روکا اللہ نے ان کے اعمال برباد کر دیئے'' (۸/ الف) اور مثلاً سورہ مائدہ میں ہے کہ جو لوگ کافر ہوئے اگر ان کے لئے وہ سب کچھ ہو جو ساری زمین میں ہے بل کہ اس کے برابر اور بھی ہو اور وہ اس سب کو قیامت کے دن کے عذاب کے بدلے میں فدیئے میں دینا چاہیں تو بھی ان کا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ وہ چاہیں گے کہ (جہنم کی) آگ سے نکل جائیں لیکن یہ اس میں سے ہرگز نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لئے دائمی عذاب ہوگا''۔ (۸/ ب) پس رسالت محمدیہؐ سے انکار کرنے کے باوجود اُخروی نجات کی امید رکھنا زبردست خود فریبی ہے۔

(ج) اُخروی نجات کا غلط مفہوم جن قرآنی آیات سے کشید کیا گیا ہے۔ ان میں مسلمانوں کے

ساتھ یہود ونصاریٰ اور صابئین کا ذکر ہے۔ اگر یہ مفہوم درست ہوتا کہ نجات کے لئے رسالت محمدیہ پر ایمان کی ضرورت نہیں تو غیر مسلموں میں سے یہاں یہود ونصاری اور صابئین ہی کی تخصیص کیا معنی رکھتی ہے؟ ایسی نجات تو مجوسیوں، بت پرست مشرکین وغیرہ دیگر اہل مذاہب کو بھی حاصل ہونی چاہئے۔ یہاں اصل حقیقت یہ ہے کہ سچا دین ہمیشہ سے اسلام رہا ہے جس کے اصول یعنی عقائد کبھی تبدیل نہیں ہوئے البتہ شرائع بدلتی رہی ہیں۔ سورہ اٰل عمران میں ہے کہ ''بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی رہا ہے اور اہل کتاب نے علم آجانے کے بعد آپس میں ضد اضدی کی وجہ سے اختلاف کیا''۔ (۸/ ج) متعلقہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا بھی اسلام ہی تھا لیکن یہود ونصاریٰ نے بعد میں اس میں تحریف کر ڈالی اس تحریف کی وجہ سے اور پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے وہ کافر ہو گئے۔ اسی سورہ آل عمران میں ہے کہ ''جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا (۹/ الف) چوں کہ سچا دین ہمیشہ سے اسلام ہی رہا ہے اس لئے کسی حقیقت کو جو نام بھی دیا جائے، ناموں کے اختلاف سے اصل حقیقت تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ حضرت موسیٰ کی امت یہودی اور حضرت عیسیٰ کی امت نصاریٰ اور عیسائی، کے نام سے مشہور ہوئی تو اس سے یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہی کہ جن یہودیوں نے اپنے زمانے میں موسوی شریعت کی صحیح پیروی کی اور جن عیسائیوں نے اپنے زمانے میں عیسوی شریعت پر صحیح معنوں میں عمل کیا وہ یہود ونصاریٰ یا عیسائی کہلاتے رہے ہوں وہ بہر حال باعتبار حقیقت لغوی معنی کے لحاظ سے مسلم ہی تھے، اگرچہ وہ اس نام سے اصطلاحی طور پر مشہور ومعروف نہ ہوئے ہوں۔ قرآن کریم کی متعلقہ آیات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اُخروی نجات صرف امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے حصے میں ہی نہیں آئی، بل کہ امم سابقہ میں سے جو لوگ بھی ایمان اور اعمالِ صالحہ کی نعمت سے بہرہ مند تھے وہ بھی سب کے سب مُسلم ہونے کی وجہ سے نجات یافتہ لوگوں میں شامل ہیں۔ اُمم سابقہ میں سے اب صرف یہود ونصاریٰ ہی باقی ہیں۔ دیگر کئی مذاہب کی طرح صابی مذہب بھی دنیا سے ناپید ہو چکا ہے۔ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ کسی بھی نبی کا انکار کفر ہے اس لئے یہودی جو کبھی مُسلم تھے بعض اسرائیلی انبیا کو قتل کرنے، حضرت عیسیٰ بن مریم اور خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ سے پہلے عیسائیوں کی اکثریت بھی تثلیث (تین خداؤں) کے مشرکانہ عقائد کی وجہ سے اسلام سے خارج ہو چکی تھی۔ بعد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ان کے کفر کا ایک اور سبب بن گیا۔ سورہ مائدہ میں ہے ''بے شک وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ مسیح بن مریم ہی

اللہ ہے، حال آں کہ مسیح نے ان سے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ بے شک جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اللہ نے اس پر جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہوگئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے حال آں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اگر یہ لوگ ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان کفر کرنے والوں کو ضرور بالضرور دردناک عذاب پہنچے گا۔ یہ لوگ اللہ سے توبہ کیوں نہیں کرتے۔ اور اس سے معافی کیوں نہیں مانگتے؟ حال آں کہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔(۹/ب) اور اسی سورہ مائدہ میں ہے کہ بے شک وہ لوگ کافر ہوگئے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی ہے۔(اے پیغمبر!) تو ان سے کہہ دے کہ اگر اللہ مسیح بن مریم، اس کی ماں اور روئے زمین کے سب لوگوں کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جو اللہ پر کچھ بھی اختیار رکھتا ہو؟ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک اللہ ہی ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (اس نے مسیح بن مریم کو بغیر باپ کے پیدا کردیا) اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۹/ج)۔ان مضامین سے بھی معلوم ہوا کہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر یہود ونصاریٰ کا اللہ پر ایمان کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہرگز مقبول نہیں بل کہ مردود ہے۔

(د) ساتویں شبہے کے جواب میں قبل ازیں مذکور ہو چکا ہے کہ صرف عقل سے ہی صراط مستقیم کی پوری اور صحیح معرفت ممکن نہیں ورنہ بعثتِ انبیا کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہود ونصاریٰ اگر پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر اتاری گئی کتاب قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تو انہیں ایمان اور اعمال صالحہ کی صحیح معرفت کے لئے حضرت موسیٰ اور دیگر انبیا پر نازل ہونے والی وحی اور آسمانی کتب سے مدد حاصل کرنا ہوگی۔ ان ہی کتب کا مجموعہ آج کل بائبل کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ موجودہ بائبل کے مضامین شد ومد سے گواہی دے رہے ہیں کہ اصل آسمانی کتب میں شرم ناک تحریف ہو چکی ہے اور اس کی وجہ سے اس میں کفریہ مضامین کی بھی بھرمار ہے۔ عیسائیت پر ہم اپنے مضامین میں ناقابل تردید شواہد سے ثابت کر چکے ہیں کہ موجودہ محرف بائبل کے مضامین کو الہامی قرار دیا جائے تو اللہ پر سچا ایمان ثابت کرنا اہل کتاب کے لئے ہرگز ممکن نہیں رہا۔ اس بائبل سے وہ ہرگز ہرگز اپنے لئے اُخروی نجات اور جنت کا استحقاق ثابت نہیں کرسکتے۔ جس بائبل میں حضرات انبیا علیہم السلام کی جانب نہایت ہی لغو اور شرم ناک جرائم منسوب کئے گئے ہوں مثلاً زنا اور بدکاری کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ان نبیوں کا محبوب ترین کا مشغلہ قرار دیا گیا ہو اور اس شغل میں وہ ماں بہن بیٹی اور بہو تک میں تمیز نہ کرتے ہوں اور جس بائبل میں خدا کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جھوٹا، دغاباز، عہد شکن، ظالم اور مستقبل سے بے خبر قرار دیا گیا ہو اور جو بائبل یہود

ونصاریٰ کو کسی جنت میں پہنچانے کی بہ جائے خدا کے ہاں انہیں سنگ سار کیے جانے کے لائق ٹھہراتی ہو اور جس بائبل سے حضرت عیسیٰؑ کو سرے سے مسیحیت کے منصب سے ہی نکال دیا گیا، ایسی بائبل سے صحیح ایمان اور اعمال صالحہ کی معرفت کا دعویٰ کرنا اور اُخروی نجات کی امید رکھنا مضحکہ خیز خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ عیسائیت پر ہمارے متعلقہ مضامین میں سے اگر صرف ''مجنون کون ہے؟'' کے عنوان کے تحت مباحث کا مطالعہ ہی کرلیا جائے تو انصاف پسند حضرات کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہوگا۔ (۱۰/الف)

ان حالات میں اہل کتاب اور دیگر غیر مسلموں کا یہ خیال کہ رسالت محمدیہ پر ایمان لائے بغیر بھی نجات ممکن ہے، کیسے درست ہوسکتا ہے؟ چناں چہ قرآن کریم میں مثلاً سورہ بینہ میں ہے کہ کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا (بت پرست) مشرکین ہوں ان کے لئے (کفر سے) باز آنا ممکن ہی نہیں رہا تھا جب تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل نہ آجائے (وہ دلیل یہ تھی) کہ اللہ کا ایک رسول (یعنی محمد ﷺ) ہو جو ان پر پاکیزہ صحیفے (قرآنی سورتیں مضامین پڑھے جس میں صحیح اور درست احکام ہیں (۱۰/ب (یہاں پہلی آیت کے ابتدائی اور کلمات، لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین میں، من، بیانیہ ہے کہ سب ہی اہل کتاب اور مشرکین کافر ہیں۔ اس کے بیانیہ ہونے کا ثبوت لفظ مشرکین سے مل رہا ہے کیوں کہ یہ سمجھنا ہرگز درست نہیں کہ کچھ مشرکین تو کافر اور کچھ مشرکین مومن ومسلم ہوتے ہیں۔ اور کفار کے متعلق یہ مذکور ہو چکا ہے کہ وہ اخروی نجات سے محروم رہیں گے۔ پس رسالتِ محمدیہؐ اور قرآن پر ایمان کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ تورات وانجیل میں بے حد وحساب تحریف سے گزشتہ انبیا علیہم السلام کی سچی تعلیم کا بہت بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ نزول قرآن سے کچھ عرصہ پہلے تک ورقہ بن نوفل جیسے نہایت ہی قلیل تعداد میں ایسے عیسائی موجود تھے جو تثلیث وکفارے کے مشرکانہ عقائد کے قائل نہیں تھے لیکن نزول قرآن کے ایام تک یہ لوگ تقریباً نابود ہو چکے تھے۔ اسی لئے قرآن کریم میں سب ہی اہل کتاب کو من حیث المجموع کافر قرار دیا گیا اور بتایا گیا کہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ پر نزول قرآن کے بغیر ان لوگوں کے لئے راہ ہدایت کو پالینا ممکن نہیں رہا تھا۔ پس رسالتِ محمدیہؐ پر ایمان لائے بغیر اخروی نجات نہیں ہوسکتی۔

(ھ) ممکن ہے کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ رسالت محمدیہؐ پر ایمان تو سب کے لئے مطلوب ہے لیکن شریعت محمدیہ پر عمل کے سب لوگ پابند نہ ہوں بل کہ جو چاہے مسلمان کہلا کر اس شریعت پر عمل کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہتا ہوا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول سمجھنے پر اکتفا کرے۔ شاید اسی لئے بعض غیر مسلم حضرات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے حد مدح وثنا کرتے ہیں اور بہت

سے حضرات آپ کی شان میں نعتیہ کلام بھی پیش کرتے ہیں۔لیکن ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص خلوصِ دل سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرے تو اسے لازماً آپ پر نازل شدہ کتاب قرآن کریم پر بھی ایمان لانا ہوگا۔قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اتباعِ محمدی کے بغیر اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس سے محبت کا دعویٰ مردود ہے۔مثلاً سورہ آل عمران میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو (لوگوں سے) کہہ دے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری (یعنی محمد ﷺ) کی پیروی کرو تو اللہ (بھی) تم سے محبت کرے گا اور تمہارے لئے تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔تو کہہ دے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اگر وہ منہ پھیریں تو بے شک اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا''۔(۱۰/ ج) یعنی صرف رسالت محمدیہ پر ایمان لانا ہی کافی نہیں بل کہ اس ایمان کا اظہار بہ نیتِ اطاعت ہونا اسلام کی اولیں بنیاد ہے ورنہ محض اقرار رسالت سے کوئی بھی شخص دین اسلام میں داخل نہیں ہوگا اور نجات اسلام ہی میں منحصر ہے۔اور مثلاً سورہ نساء میں ہے کہ ہم نے جب بھی کوئی پیغمبر بھیجا ہے تو اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق اس کی فرماں برداری کی جائے (۱۱/ الف)۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت آفاقی اور عالمی ہے اور دنیا بھر کے لوگ آپ کی اطاعت واتباع کے پابند ہیں مثلاً سورہ انعام میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ (سب سے پہلے) تم (اہل عرب) کو ڈراؤں اور (پھر) ہر اس شخص کو (اللہ کی نافرمانی اور کفر کی صورت میں اللہ کے عذاب سے) ڈراؤں جس تک بھی یہ پہنچے (۱۱/ ب) اور مثلاً سورہ اعراف میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے سو تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ (۱۱/ ج) اس سے معلوم ہوا کہ رسالتِ محمدیہ پر ایمان اور شریعتِ محمدیہ پر عمل کئے بغیر اُخروی نجات ممکن نہیں۔

(و) دین اسلام میں اگر عقائد وایمانیات کا ذکر تفصیل سے کیا جائے تو اسے ایمانِ مفصل کہا جاتا ہے۔اگر ان عقائد وایمانیات کا اظہار مختصر طریقے سے کیا جائے تو اسے ایمانِ مجمل کہتے ہیں۔یہاں مفصل اور مجمل کے الفاظ ایمان کی نہیں بل کہ ایمان کو زبان سے ظاہر کرنے کی صفت ہیں ورنہ ایمان کوئی ایسی مادی وحسی شے نہیں جو پھیلتی اور سکڑتی نظر آتی ہو۔تمام ایمانیات کی جڑ یا اصل ''ایمان باللہ'' یعنی اللہ پر ایمان ہے۔باقی ایمانیات خود بہ خود اس کے اندر داخل ہیں۔کلمہ طیبہ ''لآ الٰہ الا اللہ'' سی ایمان باللہ کا اظہار اور تمام اصول وفروغ کا جامع عنوان ہے۔بسا اوقات قرآن کریم میں ایمان باللہ یعنی اللہ پر ایمان

کے ساتھ آخرت پر ایمان کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ آخرت کے عقیدے کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے اولین مخاطب مشرکینِ عرب تھے جو آخرت اور حیات بعد الممات (مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے) کے منکر تھے۔ ورنہ ایمان باللہ میں ساری ایمانیات از خود داخل ہیں۔ چناں چہ اہل اسلام میں ایمان مفصل کے مشہور و معروف کلمات کا مفہوم یہ ہے کہ میں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھی اور بری تقدیر پر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لایا یا لائی۔ اگر ان ایمانیات کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہ ہو تو تین ایمانیات اللہ، رسالت اور آخرت پر ایمان اپنے اندر باقی ایمانیات کو بھی سمو لیتا ہے کیوں کہ فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان کا تعلق عقیدۂ رسالت سے ہے جب کہ تقدیر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا تعلق عقیدۂ آخرت سے ہے اگر مزید اختصار مقصود ہو تو ایمان باللہ ہی باقی تمام ایمانیات کی اصل اور بنیاد ہے، چناں چہ اہل اسلام میں ایمانِ مجمل کے مشہور و معروف کلمات کا مفہوم یہ ہے کہ میں اللہ پر ایمان لایا یا لائی جیسے کہ اس کے نام اور اس کی صفات ہیں اور میں نے اس کے سارے احکام قبول کر لئے۔ زبان سے (میرا یہ) اقرار ہے اور دل سے تصدیق ہے۔ اگر ایمان کو ظاہر کرنے کا اس سے بھی مختصر طریقہ مطلوب ہو تو کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سب کو محیط ہے۔ اس سے بھی مختصر طریقے سے اسلام کا اظہار اور ایمانیات کا اقرار مطلوب ہو تو لا الہ الا اللہ، پورے دین کا جامع عنوان ہے۔ پس اللہ اور آخرت پر ایمان کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی ایمانیات یعنی رسولوں، آسمانی کتابوں، فرشتوں، تقدیر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ ''وہ (اہل کتاب) سب کے سب یک ساں نہیں ہیں بل کہ ان میں ایک جماعت (حق پر) قائم رہنے والی بھی ہے۔ یہ لوگ راتوں کو (اللہ کی کتاب) آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں اور (اللہ کو) سجدے کرتے ہیں۔ یہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں یہ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ یہ جو نیکی بھی کریں گے تو ہرگز ان کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے (۱۲/ الف) یہاں وہ اہل کتاب مراد ہیں جو اپنے زمانے میں صحیح ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمت سے مالا مال تھے ورنہ دور حاضر کی بائیبل کی تلاوت ہرگز مراد نہیں ہے جو بعض اچھے مضامین کے باوجود کفریہ مضامین سے بھی بھری پڑی ہے اور اس محرف بائبل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کی بدترین توہین کی گئی ہے۔ اسی طرح متعلقہ قرآنی آیات کے مذکورہ مفہوم میں وہ اہل کتاب بھی شامل ہیں جو خاتم الانبیا حضرت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ مثلاً دور نبوی میں عبداللہ بن سلام، اسد بن عُبید، ثعلبہ بن سعیہ اور اسد بن سعیہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے اسلام قبول کیا۔ نجاشی شاہ حبشہ اور اس کے خاندان نے اسلام قبول کیا۔ دور نبوی کے بعد کے زمانوں میں بھی بہت سے اہلِ کتاب اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ کفر پر قائم رہنے والے اہل کتاب کے متعلق تو صاف واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی بھی کافر کی عاقبت ہرگز اچھی نہ ہوگی۔ الغرض مذکورہ تمام مباحث سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر اور آپ کی اتباع کئے بغیر اُخروی نجات ہرگز (پھر دہرایئے) ہرگز ممکن نہیں ہے۔ وما علینا الا البلاغ المبین

چودھواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے کہ ہم کسی کو عذاب نہیں دیتے جب تک کہ ہم پیغمبر کو نہ بھیجیں (۱۲/ب)۔ اس سے تو بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول (معاذ اللہ) باعث عذاب ہے۔ اس شبہ کا جواب بھی سورہ فاتحہ کے کلمات رب العالمین میں مضمر ہے۔ اس کائنات کے تمام تکوینی قوانین یعنی قوانین فطرت اس کی ربوبیت کو حیرت انگیز طریقے سے ظاہر کرتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ان قوانین کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جائے یا سہو وخطا کی بنا پر ایسا ہو، بہ ہر حال نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص غلطی سے زہر کھالے یا بغیر ارادے کے چھت سے نیچے گر پڑے تو بھی عموماً نقصان کا کم وبیش سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اللہ چاہتا تو رسولوں کے ذریعہ اتمام حجت کئے بغیر اور لوگوں کو متنبہ کئے بغیر ان کا مواخذہ کرتا، لیکن یہ اس کی رحمت ہے کہ وہ انبیا علیہم السلام یا ان کے جانشین اہل حق کے ذریعے حق وباطل، صحیح وغلط اور جائز وناجائز میں پوری طرح فرق واضح کر کے پہلے اپنی حجت پوری کرتا ہے پھر نافرمانوں کو پکڑتا ہے۔ انبیا علیہم السلام پر ایمان لانے والے لوگ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے مستحق ہوئے۔ یوں حضرات انبیا علیہم السلام لوگوں کے لئے اللہ کی طرف سے رحمت ہوتے ہیں۔ کوئی ان کا انکار کر کے خود ہی عذاب الٰہی کو دعوت دے تو اس میں اس کا اپنا قصور ہے۔ جس طرح دنیوی مفادات کا اللہ تعالیٰ نے انتظام فرمایا اور تمام مادی ضرورتیں پوری فرمائیں اسی طرح اس نے حضرات انبیا علیہم السلام کے ذریعے انسانوں اور جنات کی اخروی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے بھی انتظامات کئے، کیوں کہ دنیا کی زندگی تو فانی ہے اور اُخروی زندگی باقی ہے۔ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فانی زندگی کے لئے تو تمام اسباب مہیا فرمائے اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لئے کوئی راہ نمائی نہ فرمائے۔ انبیا علیہم السلام کی بعثت سے لوگوں پر حجت پوری ہوجاتی ہے۔ کل کلاں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکے گا کہ مجھے سیدھا راستہ نہیں دکھایا گیا تھا، سورہ نساء میں بعثتِ انبیاء کے متعلق ارشاد ہے کہ ''(یہ رسول اس لئے بھیجے گئے) تاکہ رسولوں کی بعثت کے بعد لوگوں

کا اللہ پر کوئی الزام نہ رہے'' (۱۲/ ج) اور مثلاً سورہ انعام میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ اللہ ہی کی حجت غالب ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا''۔ (۱۳/ الف) قوانین شریعت میں خطا اور نسیان کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا ہے۔ (۱۳/ ب) قوانینِ فطرت کو خطا اور نسیان کی بنا پر نظر انداز کرنے سے جو نقصان ہوتا ہے، اس کی تلافی رب العالمین نے اپنے فرماں بردار بندوں کے لئے یوں فرمادی ہے کہ ''اگر کسی کو کوئی کانٹا بھی چبھا ہو یا کوئی معمولی سے معمولی دنیوی نقصان بھی ہوا ہو تو وہ انہیں اس کا بھی اجر دے گا۔ کبھی تو ایسے نقصان کی دنیا میں ہی تلافی کردی جاتی ہے کہ تکلیف کے بدلے راحت میسر آتی ہے ورنہ آخرت میں تو صبر کرنے والوں کو بے حد و بے حساب اجر دیا جائے گا'' (۱۳/ ج) لہٰذا کوئی اشکال باقی نہیں رہ جاتا۔

پندرھواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ امت محمدیہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منعم علیہم (انعام یافتہ) لوگوں کی اولیں معیاری جماعت کون سی ہے؟ اس کا جواب بھی سورہ فاتحہ میں یوں موجود ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے کی نعمت سے بہرہ مند اللہ تعالیٰ کے منعم علیہم (انعام یافتہ) لوگوں کے مقابلے میں اس انعام سے محروم بدقسمت لوگوں کا بھی ذکر ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور اسی طرح جو سیدھے راستے سے بھٹک کر گم راہ ہوئے لہٰذا عقل سلیم کا بدیہی فیصلہ یہی ہے کہ امت محمدیہ میں انعام یافتہ لوگوں کا اولیں طبقہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہی ہوسکتے ہیں، چناں چہ قرآن کریم عقلِ سلیم کے اس درست فیصلے کی تصدیق کرتا ہے، مثلاً سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول کو حجۃ الوداع کے موقع پر بہ صیغۂ خطاب یوں مخاطب فرمایا ہے کہ ''آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لئے اسلام کو (بہ طور دین) پسند کرلیا'' (۱۴/ الف)۔ اور سورہ نساء میں ہے کہ جو شخص بعد اس کے کہ حق اس پر واضح ہو چکا (اگر وہ خود غور نہ کرے یا حق کو پہچان لینے کے بعد بھی انکار کرے تو اس کا اپنا قصور ہے) اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی کرے تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جدھر اس نے خود ہی رخ کرلیا ہے اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے'' (۱۴/ ب)۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس امت کا اولیں انعام یافتہ طبقہ ہیں اور جس بات پر وہ متفق ہوجائیں وہ دین میں حجت (معتبر و مستند) سمجھی جائے گی۔ چوں کہ صحابہ کرامؓ کے بعد کے طبقات میں بھی مسلمان اہل علم کا اجماع دین میں حجت ہے اس لئے سورہ نساء کی آیت میں یہاں ''مومنین'' کا لفظ لایا گیا ہے کہ ان کے اجماعی راستے کا مخالف جہنم رسید ہوگا، لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ نزولِ آیت کے موقع پر دنیا میں مومنین کی جماعت صرف اور صرف اصحاب رسول ہی تو تھے۔

سولہواں شبہہ: یہ ہوسکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیسرے خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں اور چوتھے خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کے دور میں صحابہ کرامؓ میں اختلافات پیدا ہوئے لہٰذا یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولیں معیارِ حق کے لحاظ سے (معاذ اللہ) معتبر نہ رہے۔

اس شبہے کا جواب بھی سورہ فاتحہ میں موجود ہے، عقل ونقل سے معلوم ہو چکا کہ صحابہ کرامؓ امت محمدیہ کا اولیں انعام یافتہ طبقہ ہیں جنہیں سورہ مائدہ میں بہ صیغۂ خطاب اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ میں نے اپنی نعمت تم پر پوری کردی ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے لہٰذا عقل سلیم کا فیصلہ یہی ہے کہ بعد کے حوادث جیسے بھی ہوں، ان سے ان حضرات کا مقام ومرتبہ ہرگز مجروح نہیں ہوتا۔ عقل سلیم کے اس درست فیصلے کی توثیق قرآن کریم سے بھی ہورہی ہے، مثلاً جب حضرت یوسفؑ نے اپنے والد ماجد حضرت یعقوبؑ کو اپنا خواب بتایا کہ میں نے خواب میں گیارہ ستاروں، سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کررہے ہیں تو حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ اے میرے بیٹے! اپنے اس خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا، ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے خلاف کوئی تدبیر کریں شیطان تو انسان کا کھلا دشمن ہے اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھے برگزیدہ کرے گا اور تجھے معاملہ فہمی (خوابوں کی تعبیر وغیرہ) بھی سکھائے گا اور اپنی نعمت تجھ پر اور آل یعقوب پر (یعقوب کے گھرانے برادرانِ یوسف اور ان کی اولاد وغیرہ پر) پوری کرے گا جیسے کہ اس نے اس سے پہلے تیرے دادا اور پردادا ابراہیم اور اسحاق کو بھی اپنی نعمت سے پوری طرح نوازا تھا، بے شک تیرا رب بہت بڑے علم والا اور زبردست حکمت والا ہے (۱۴/ ج)۔ یہاں بار بار غور کیجئے، حضرت یعقوبؑ نے برادرانِ یوسف کو مُنعم علیھم (انعام یافتہ) لوگوں میں شامل فرمایا۔ بعد میں ان ہی برادران یوسف نے حضرت یعقوبؑ کی دنیوی حیات طیبہ میں ہی نہایت ہی سنگین (پھر دہرایئے) نہایت ہی سنگین جرائم کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے اپنے باپ کو دھوکہ دے کر حضرت یوسفؑ کو ایک کنویں میں جا پھینکا۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ نہایت بے رحمی کا سلوک روا رکھ کر اخوت کے تقاضوں کو بری طرح پامال کیا۔ گھر آکر باپ سے جھوٹ بولا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ باپ کو سالہا سال تک سخت رنجیدہ اور پریشان کئے رکھا یہاں تک کہ باپ کی آنکھیں شدت غم سے روتے روتے سفید ہوگئیں۔ یوں برادران یوسف نے حق ابوت کو بھی بے رحمی سے ایک دو دن کے لئے نہیں بل کہ سال ہا سال تک پامال کیا۔ پھر باپ ایک عام شخص نہیں بل کہ اللہ کا برگزیدہ پیغمبر ہے، یوں برادرانِ یوسف نے حق نبوت کو بھی قطعاً ملحوظ نہ رکھا۔ قرآن کریم کی سورہ احزاب میں ہے کہ ''جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں ان کو اللہ نے دنیا اور آخرت میں ملعون کردیا ہے اور ان کے لئے نہایت رسوا کن عذاب ہے اور جو

لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو ان کے کسی قصور کے بغیر ایذا دیں وہ (بڑے ہی) بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں (۱۵/الف)۔ اب بتائیے کہ جب حضرت یعقوبؑ نے پہلے ہی برادرانِ یوسف کو منعم علیہم (انعام یافتہ) ٹھہرا دیا تو کیا کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ برادران یوسف کے بہ ظاہر نہایت ہی سنگین جرائم کے پیش نظر انہیں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ملعون قرار دے اور استدلال میں قرآن کریم کی سورہ احزاب کی متعلقہ آیات پیش کرے جن کا ترجمہ ابھی اوپر مذکور ہو چکا ہے؟ ہرگز نہیں، واللہ ہرگز نہیں۔ ایسا شخص خود ملعون ہو جائے گا۔ حضرت یعقوبؑ نے خواب کی تعبیر بتاتے وقت آخر میں اللہ تعالیٰ کے علیم وحکیم ہونے کا حوالہ بھی دیا جس میں اس بات کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ برادران یوسف کے بارے میں اگر ذہن میں شکوک وشبہات پیدا ہوں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کہیں زیادہ علم والا ہے اس کے کاموں کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے تو بہتر ورنہ اُس کے کاموں کی حکمت ہماری عقل سے بالاتر ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ علیم ہونے کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو برادرانِ یوسف کے بعد کے کاموں کا پہلے ہی سے بہ خوبی علم تھا اس کے باوجود اس نے انہیں مُنعم علیہم قرار دیا اور ان کے تمام جرائم کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا تو وہ حکیم (صاحب حکمت) بھی ہے۔ زید، عمرو اور بکر وغیرہ کون ہوتے ہیں جو لب کشائی کی جسارت کریں؟ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بدترین دشمنوں قریش مکہ کے لئے وہی بات دہرائی جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی لاتثریب علیکم الیوم آج تم پر کوئی الزام نہیں، کوئی سرزنش نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ الغرض منعم علیہم ہونے کی بنا پر جس طرح برادران یوسف مغفور ومرحوم ہیں، صحابہ کرامؓ بھی منعم علیہم ہونے کی بنا پر مغفور ومرحوم ہیں، چناں چہ مثلاً سورہ انفال میں ہے کہ ''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے انہیں پناہ دی اور (ان کی) مدد کی یہ لوگ پکے سچے مومن ہیں ان کے لئے (گناہوں سے) بخشش ہے اور عزت کی روزی'' (۱۵/ب) اور مثلاً سورہ توبہ میں ہے کہ بلاشبہ اللہ نے ان ہی پر اور مہاجرین وانصار پر رحمت سے توجہ فرمائی جنہوں نے تنگی کے وقت اس (نبی) کی پیروی کی بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل متزلزل ہو جائے پھر اللہ نے ان کے دل کا حال بدل کر) ان پر بھی رحمت سے توجہ فرمائی، بلاشبہ وہ ان پر نہایت ہی مہربان اور مشفق ہے۔ (۱۵/ج) سورہ حدید میں ہے کہ تم (اصحاب رسول) میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے (اللہ کی راہ میں مال) خرچ کیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والوں کے برابر نہیں بل کہ وہ ان سے بہت بڑے درجے کے ہیں جنہوں نے فتح (مکہ) کے بعد (مال) خرچ کیا اور قتال کیا۔ البتہ اللہ نے بھلائی کا وعدہ تو سب ہی سے کر لیا ہے اور اللہ تمہارے اعمال

سے باخبر ہے''۔(۱۶/الف) غزوہ فتح مکہ کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے متعلق پہلے ہی مسلمانوں کو ایک بشارت سنادی کہ عین ممکن ہے کہ اللہ تمہارے درمیان اور ان (مشرکین مکہ) کے درمیان جن سے (فی الحال) تمہاری دشمنی ہے محبت پیدا کردے اور اللہ (خلاف توقع مشرکین مکہ کے دلوں کا حال بدلنے پر) قادر ہے اور اللہ (ان مشرکین کے گناہوں کو قبول اسلام کے بعد) بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے''(۱۷/ب) اور مثلاً سورہ تحریم میں ہے کہ اللہ اس (قیامت کے) دن نبی کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، ان کو رسوا نہیں کرے گا (بلکہ) ان کا (ایمانی) نور ان کے آگے اور داہنی طرف روشنی کرتا ہوا چل رہا ہوگا (اور وہ اللہ سے التجا کر رہے ہوں گے کہ) اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لئے پورا کر اور ہمیں معاف فرما بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔(۱۶/ج)

جن صحابہ کرامؓ نے قبلۂ اول بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں اللہ تعالیٰ نے ان کا ایمان باقی رکھنے کی ضمانت دے دی **وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ان اللہ بالناس لرؤف رحیم**۔ (۱۷/الف) ''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے بے شک اللہ لوگوں پر نہایت ہی مشفق (اور) مہربان ہے''، ایمان سے اگر نماز مراد لی جائے تو کسی بھی نیک کام کے اجر کے بقا سے ایمان کی بقا بھی لازم آتی ہے کہ کیوں کہ مرتد کی نیکیاں تو برباد ہو جاتی ہیں۔ منافق کا تو ایمان سرے سے ہوتا ہی نہیں، لہٰذا منافقین مذکورہ آیت کے مصداق سے از خود نکل گئے۔ منافقین کے خلاف جہاد اور سختی کرنے کا حکم خاص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قرآن کریم میں دو مرتبہ دیا گیا ہے (۱۷/ب) لہٰذا جن حضرات سے آپ نے تادمِ آخر مضبوط معاشرتی تعلقات برقرار رکھے وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ جن خوش نصیب حضرات نے اپنی ولایت اور سرپرستی میں اپنی بیٹیاں اللہ کے پیغمبر کے نکاح میں دیں وہ ہرگز منافق نہیں ہو سکتے۔ آپ کی ازواج مطہرات ہرگز منافق نہیں ہو سکتیں۔ آپ اپنی ربیبات (پروردہ خواتین) کو بھی ہرگز منافقین کے حوالے نہیں کر سکتے۔ تمام خلفائے راشدینؓ سے آپ کے صہری (نکاح کے رشتے کے) روابط ہیں۔ غزوہ بدر میں کوئی بھی منافق ہرگز شامل نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس غزوے کے سلسلے میں صرف دو متحارب جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ ایک جماعت اللہ کی راہ میں لڑ رہی تھی اور دوسری جماعت کفار کی تھی **فئۃ تقاتل فی سبیل اللہ واخریٰ کافرۃ**،(۱۷/ج) اگر اس غزوے میں مسلمانوں کے ساتھ منافقین بھی ہوتے تو اللہ تعالیٰ دو کی بہ جائے تین جماعتوں کا ذکر کرتا۔ نیز منافق کا قتال ہرگز قتال فی سبیل اللہ نہیں کہلاتا۔ اس متعلقہ آیت کے آخر میں غزوہ بدر میں شریک صحابہ کرامؓ کی اللہ تعالیٰ نے یوں مدح فرمائی ہے **واللہ یوید بنصرہ من یشآء**، اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی مدد سے نوازتا ہے۔ اللہ

تعالیٰ ہمیشہ اپنے مقرب بندوں کی ہی مدد فرماتا ہے۔ قرآن کریم میں ایسے مضامین ہرگز نہیں ملیں گے کہ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی مدد کی، فرعون کی تائید کی وغیرہ۔ کفار کو دنیا میں بہ ظاہر جو مفادات حاصل ہوتے ہیں، انہیں اللہ کی نصرت وتائید نہیں بل کہ استدراج (بہ تدریج عذاب کی گرفت میں لے آنا) قرار دیا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت میں شامل افراد کی اللہ تعالیٰ نے بے حد مدح فرمائی ہے اور مستقبل قریب وبعید میں فتوحات وغنائم کی لاتعداد اور لگاتار بشارتوں سے انہیں نوازا ہے اور ان سے اپنی رضامندی کا یہ کہہ کر اظہار فرمایا ہے کہ اللہ کو ان کے دلوں کا حال خوب معلوم ہے'' (۱۸/ الف) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں سے راضی نہیں ہوا کرتا (۱۸/ ب) جد بن قیس اس بیعت رضوان میں شامل ہی نہیں ہوا تھا۔ غزوہ حنین واوطاس میں حاصل ہونے والے بیش بہا اموال غنیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلب کے لئے بہت بڑی مقدار اور تعداد میں نومسلم قریش مکہ کو دیئے۔ مہاجرین کو بہت کم اور انصار کو تو ایک دانہ بھی نہیں دیا۔ فتح مکہ کے بعد اگر قریش مکہ جلد یا بہ دیر سچے دل سے اسلام قبول کرنے والے نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ فتح مکہ کے لئے روانگی کے ایام میں مہاجرین وانصار کو یہ خبر ہی کیوں دیتا کہ تمہارے اور ان قریش مکہ کے درمیان وہ دوستی قائم کردے گا حال آں کہ اللہ تعالیٰ نے دوستی قائم ہونے کی بشارت ہی نہیں دی بل کہ اس محبت کے پیدا کرنے کو اپنی طرف منسوب فرمایا کہ اللہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا فرمائے گا وہ قادر ہے اور غفورٌ رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے وہ کبھی ان لوگوں کی مدح نہیں کرتا جو فی الحال کافر یا منافق ہوں یا مستقبل میں مرتد یا منافق ہونے والے ہوں۔ اس نے تو اپنے رسول کو مخاطب کر کے دو مرتبہ حکم دیا کہ ''اے نبی! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر۔ بھلا اگر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے علام الغیوب اللہ تعالیٰ کے علم میں مستقبل میں مرتد یا منافق ہونے والے ہوتے تو وہ اپنے رسول کو کیسے اجازت دیتا کہ غزوہ حنین واوطاس کے اصل شریک مہاجرین وانصار کو نظر انداز کر کے ان نومسلموں کے گھر اموال غنیمت سے بھر دیئے جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ''اے نبی! کافروں اور منافقوں کی بات نہ ماننا تو ان کی (طرف سے) ایذا کو نظر انداز کر اور اللہ تعالیٰ پر توکل کر'' (۱۸/ ج) سورہ دھر میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو ان میں سے کسی گناہ گار اور ناشکرے کی بات نہ مان'' (۱۹/ الف) اور سورہ کہف میں ہے کہ ''تو اس شخص کی بات نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور جس کا کام افراط وتفریط میں مبتلا ہونا ہے''۔ (۱۹/ ب) اس طرح

کے احکام کے نزول کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار ومنافقین تو ایک طرف رہے فاسق وفاجر لوگوں سے مشورے لیں اور ان کی باتوں کو مان کر ان پر عمل کریں۔ حضرات شیخین (ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ) سے خصوصاً اور دیگر صحابہ کرامؓ سے عموماً آپ عمر بھر مشورہ فرماتے بھی رہے اور ان کے مشوروں کو بہ خوشی شرف قبولیت بھی بخشتے رہے۔ مثلاً غزوہ بدر کے جنگی قیدیوں کے متعلق آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مشورہ قبول فرمایا۔ صلح حدیبیہ سے پہلے قریش مکہ اور حلیف قبائل کے خلاف جنگ کی ابتدا نہ کرنے کا حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مشورہ قبول فرمایا۔ صلح نامہ حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا تھا کہ قریش مکہ کے پاس مجھے سفیر بنا کر بھیجنے کی بہ جائے حضرت عثمانؓ کو بھیجنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ ﷺ نے مشورہ قبول فرمایا۔ غزوہ احزاب کے موقع پر آپ نے حضرت سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کے مشورے کو بہ خوشی قبول فرمایا کہ غطفانی قبائل کو مدینے کی کھجوروں کی پیداوار کا کچھ حصہ دے کر ان سے صلح ہرگز مناسب نہیں ہے اور آپ نے اپنی رائے کو تبدیل فرمایا۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مندرجہ بالا مضامین کا احاطہ اور استیعاب مقصود نہیں ہے جو کچھ پیش کیا جاچکا ہے اس میں ہر اس شخص کے لئے سمجھنے اور نصیحت حاصل کرنے کا کافی سامان موجود ہے جس کا دل صحیح ہو اور جو کان لگا کر سننا چاہے ''ورنہ میں نہ مانوں کا'' کوئی علاج آج تک دریافت نہیں ہوسکا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ جس فتنۂ ارتداد کی قرآن کریم میں سورہ مائدہ میں خبر دی گئی اس کا مصداق مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے مولفۃ القلوب ہرگز نہیں ہیں، بل کہ ان ہی حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سربراہی میں فتنۂ ارتداد کو کچلا تھا۔ قرآن کریم میں ان مرتدین کے غلبے کی نہیں بل کہ مغلوب ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ چناں چہ سورہ مائدہ میں ہے کہ ''اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو عن قریب اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ وہ (اللہ) ان سے محبت کرے گا اور وہ اس (اللہ) سے محبت کریں گے وہ مومنین کے لئے نرم اور کافروں پر سخت ہوں گے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے وہ عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا (اور) جاننے والا ہے۔ (۱۹/ ج) گو جملہ شرطیہ میں موجود شرط وجزا کا خارج میں وجود اور ظہور ہر حال میں ضروری نہیں ہوا کرتا لیکن بعد میں اگر خارج میں اس کا ظہور ہو جائے تو یہ کہنا بالکل حق بہ جانب ہوگا کہ اس جملہ شرطیہ سے مستقبل میں ظاہر ہونے والے متعلقہ واقعے کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد فتنۂ ارتداد نمودار ہوا۔ مخالفین زکوٰۃ اور نبوت کے جھوٹے

دعوے دار ظاہر ہوئے۔ پس خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ اور ان کا دل و جان سے ساتھ دے کر فتنہ ارتداد کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والے صحابہ کرامؓ ہی وہ حضرات ہیں جن کے اوصاف حمیدہ سورہ مائدہ کی آیت ارتداد میں مذکور ہیں۔

فتح مکہ کے بعد عموماً اور غزوہ تبوک کے بعد خصوصاً جزیرہ نمائے عرب کے اطراف واکناف سے وفود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان وفود میں متعلقہ قبائل کے سب لوگ شامل نہیں ہوتے تھے بل کہ کچھ افراد ہی حاضر خدمت ہو سکتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ بعد میں مرتد ہوئے اور ان قبائل کے بہت سے لوگ تو ایسے بھی تھے جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تک نہ تھا۔ وفود کی صورت میں آنے والے ان لوگوں کی بڑی اکثریت نے آپ کی صحبت میں کسی جہاد میں حصہ ہی نہیں لیا تھا کیوں کہ غزوہ تبوک آخری غزوہ تھا۔ ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے تربیت واصلاح کے مواقع بھی میسر نہ آئے تھے۔ حوض کوثر والی احادیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حوض کوثر پر کچھ لوگ مجھ سے علیحدہ کر دیئے جائیں گے، میں کہوں گا یہ تو میرے اصحاب ہیں اور بعض روایات کے مطابق اصیحاب (چند ساتھی) ہیں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے کہے گا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے بعد انہوں نے کون کون سے نئے کام کیے **انك لا تدری ما احد ثوابعدك**۔ **احداث فی الدین** (دین کے اندر نئی باتیں داخل کرنے) کے مفہوم میں وسعت ہے۔ اس کا اطلاق حدِ کفر تک نہ پہنچنے والی بدعت کے علاوہ کفر پر بھی ہوسکتا ہے، کیوں کہ ہر بدعت گم راہی ہے اور کفر کی ہر صورت بھی گم راہی ہے۔ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد کفر کیا ان کے متعلق اوپر واضح کیا جاچکا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کی طرف اشارہ آیتِ قتال مرتدین میں کیا گیا تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو احداث فی الدین میں حدِ کفر کو پہنچ گئے۔ اور بہت سے حالت کفر وارتداد میں مرگئے۔ یہی لوگ حدیث کوثر کے اصل مصداق ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے **وھم المرتدون الذین ارتدوا علیٰ عھد ابی بکر فقاتلھم ابو بکر رضی اللہ عنہ** (۲۰/الف) یہ "مرتدین (جن کا حدیث حوض میں ذکر ہے) وہی لوگ ہیں جو ابو بکر صدیقؓ کے دور میں مرتد ہوگئے تھے جن کے خلاف ابو بکر صدیقؓ نے قتال کیا"، بعض اہل علم نے حدیثِ کوثر میں اصحاب کو لغوی معنی میں لیتے ہوئے عام امتی مراد لئے ہیں، کیوں کہ اس طرح کی بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ میں عیسیٰ بن مریمؑ کی طرح کہوں گا کہ (اے اللہ!) میں جب تک ان کے اندر رہا مجھے ان کے حال کا علم تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو تو ہی ان کے کاموں سے باخبر تھا۔ ظاہر ہے یہاں حضرت عیسیٰ اپنے زمانے کے حواریوں کی بات نہیں کررہے، بل کہ اپنی امت کی بات کررہے ہیں ورنہ

حواری الوہیت عیسیٰ اور تثلیث کے کبھی قائل نہ ہوئے تھے۔ یہ عقائد تو عیسائیوں میں بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ اصحاب کے لغوی معنی میں ہم زمانہ ہونے کا مفہوم پایا جانا ضروری نہیں مثلاً اصحابِ ابی حنیفہ کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لازماً امام ابوحنیفہؒ کے ہم عصر بھی ہوں۔ الغرض احادیثِ حوض اور آیت ارتداد کا اطلاق مہاجرین وانصار اور مولفۃ القلوب صحابہ کرامؓ پر نہیں ہوتا جن کے قطعی جنتی ہونے اور مغفور ومرحوم ہونے پر قرآنی محکمات موجود ہیں۔ پس جن اصحابِ رسول کے قطعی جنتی اور مغفور ومرحوم ہونے کی نہایت محکم اور ناقابلِ تاویل خبریں دی گئی ہیں، ان میں مہاجرین مکہ، انصارِ مدینہ، فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے وہ لوگ جن کی غزوۂ حنین واوطاس کے اموالِ غنیمت سے بھرپور تالیف قلب کی گئی اور ان سب کے ساتھ مل کر دیگر قبائل عرب کے وہ اصحابِ رسول جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں مانعین زکوٰۃ اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف جہاد وقتال کیا اور فتنۂ ارتداد کو بیخ دین سے اکھاڑ پھیکا، سب کے سب شامل ہیں۔ جب کوئی خبر یا بشارت کسی خاص فرد یا جماعت کے ساتھ مخصوص نہ ہو بل کہ عام ہو تو اس میں سب ہی شرائط ملحوظ ہوتی ہیں مثلاً یہ بشارت کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے، کسی خاص فرد یا گروہ کے لئے نہیں بل کہ عام ہے لہٰذا یہ بشارت متعلقہ شرائط کے تحت ہوگی کہ ماں کی خدمت کرنے والا ایمان اور دیگر اعمال صالحہ کی نعمت سے بھی بہرہ مند ہو۔ لیکن جو خبر یا بشارت کسی خاص فرد یا خاص جماعت کے لئے مخصوص ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فرد یا جماعت نے تمام متعلقہ شرائط پوری کر رکھی ہیں اور یہ کہ وہ ان شرائط پر علام الغیوب اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ہمیشہ قائم رہے گا یا بالفرض بعض شرائط یا سب ہی شرائط پر قلیل وکثیر مدت کے لئے قائم نہ رہے تو بھی بالآخر ان شرائط کو ازسرنو پورا کرلے گا تب ہی تو اسے اس خبر اور بشارت کے لئے مختص کیا گیا ہے لہٰذا یہاں اس طرح کے لغو بل کہ مضحکہ خیز شبہات کی قطعاً گنجائش نہیں کہ یہ بشارات فلاں فلاں شرائط کے ساتھ مشروط تھیں۔ اگر صحابہ کرامؓ نے بعد میں (معاذ اللہ) مرتد ہونا ہوتا اور ان کی موت کفر وارتداد یا نفاق پر ہونے والی ہوتی تو اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہوتے ہوئے انہیں مخصوص کرکے جنت ومغفرت کی اور حسنیٰ (بھلائی) کی بشارتیں ہرگز ہرگز نہ دیتا۔ سورہ انبیاء میں ہے کہ جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ (بھلائی) پہلے ہی طے ہوچکی ہے وہ سب اس (جہنم) سے دور رکھیں جائیں گے وہ تو اس کی آواز تک نہ سنیں گے اور وہ اپنی دل پسند چیزوں میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ انہیں (قیامت کے دن کی) بڑی گھبراہٹ غم گین نہیں کرسکے گی اور فرشتے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ یہی تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا تھا۔ (۲۰/ب)

متعلقہ اہم مسائل ومعارف: (الف) صحابہ کرامؓ اپنے حسن عاقبت کی یقینی وقطعی خبروں کی سے

وجہ ہمارے لئے معلوم العاقبۃ ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے بعد کسی بھی شخص کا اخروی انجام کیا ہوگا، اس کا یقینی علم کسی کو نہیں دیا گیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں لیکن ہم اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبۃ ہیں۔ عقل سلیم کا یہ بدیہی فیصلہ ہے کہ مجہول العاقبۃ لوگوں کو ہرگز یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ بہ زعم خویش کرسئ عدالت پر براجمان ہوکر معلوم العاقبۃ صحابہ کرامؓ کے خلاف فیصلے صادر کریں، ان کے خلاف اپنے دلوں میں بغض وکینے کو پروان چڑھائیں یا زبان وقلم سے ان کے خلاف مطاعن ومثالب کی فہرست مرتب کریں۔ عقلِ سلیم کے اس فیصلے کو کتاب اللہ کی بھی بھرپور تائید وتوثیق حاصل ہے۔ مثلاً سورہ حجر میں اموال فے کے مصارف کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین وانصار کی بے حد مدح فرمائی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے کہ جو لوگ ان کے بعد آئیں گے وہ کہیں گے اے ہمارے رب! تو ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ان ایمان والوں کے خلاف ہمارے دلوں میں کینہ (اور دشمنی) نہ ڈال۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بے حد مشفق (اور) نہایت مہربان ہے (۲۰/ ج) اس سے صاف معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ ہم سب کے لئے سابق الایمان اور امت محمدیہ کا اولین طبقہ ہیں۔ ان کے خلاف دلوں میں کینہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بدقسمتی سے ان کے خلاف کینہ پرور بھی دنیا میں موجود ہوں گے ورنہ مذکورہ دعا سکھانے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ علم اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں جہالت بھی موجود ہے، سعادت اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں شقاوت بھی موجود ہے، غنا اور استغنا اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں فقر وفاقہ اور حرص وطمع بھی موجود ہے، ایمان واسلام اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں کفر وبغاوت بھی موجود ہے، عافیت اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں بلا اور مصیبت بھی موجود ہے، صحت اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں مرض بھی موجود ہے، حسن عاقبت اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں سوء عاقبت بھی موجود ہے، بعینہٖ اسی طرح امت محمدیہؐ کے اولیں طبقے اور سابق الایمان صحابہ کرامؓ کے خلاف اپنے دلوں میں کینہ وبغض نہ ہونے کی اللہ تعالیٰ سے دعا ہمیں اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے مقابلے میں ان حضرات سے کینہ رکھنے والے بھی موجود ہوں گے اور ان کا باطل پر ہونا اسی دعا سے اظہر من الشمس ہوجاتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام معصوم عن الخطا نہیں ہیں اس لئے بعد والے نہ صرف اپنے لئے بل کہ ان کے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا کریں گے نہ یہ کہ ان کے فرضی یا حقیقی گناہ شمار کرتے رہیں۔ صحابہ کرامؓ کے لئے استغفار کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیا گیا ہے۔ غزوہ احد میں جن صحابہ کرامؓ سے لغزش ہوئی ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو نرم کردیا اور بعد میں حکم دیا

کہ تو انہیں معاف کردے، ان کے لئے استغفار کر اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ بھی لیا کر (۲۱/الف) غزوہ تبوک میں جن چند اصحاب سے لغزش ہوئی اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمادیا اور اپنے رسول کو حکم دیا کہ تو ان کے اموال سے صدقہ وصول کرلیا کر اور ان کے لئے دعائے رحمت بھی کیا کر کیوں کہ تیری دعا سے انہیں سکون نصیب ہوتا ہے (۲۱/ب) سورہ محمد میں ہے کہ تو اپنی (اجتہادی) لغزش پر بھی اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کی کوتاہیوں پر بھی اللہ سے استغفار کیا کر (۲۱/ج) جو عورتیں اسلام قبول کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کریں ان کے لئے بھی آپ کو حکم ہوا کہ تو ان کے لئے استغفار کر (۲۲/الف) صحابہ کرامؓ کے لئے فرشتے بھی استغفار کرتے ہیں۔ سورہ مومن میں ہے کہ ''عرش کے اٹھانے والے فرشتے اور اس کے آس پاس کے فرشتے اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے استغفار کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے ہر چیز کو اپنی مغفرت اور علم سے گھیر رکھا ہے پس تو انہیں بخش دے جو توبہ کریں اور تیری راہ کی پیروی کریں اور تو انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ اے ہمارے رب! تو انہیں ہمیشگی والی جنتوں میں لے جا، جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے باپ دادوں اور اولاد میں سے (بھی) ان سب کو جو نیک عمل والے ہیں بے شک تو غالب اور صاحب حکمت ہے'' (۲۲/ب) سورہ شوریٰ میں ہے کہ ''سب فرشتے اپنے رب کی تسبیح حمد کے ساتھ کرتے ہیں اور جو زمین میں (مومنین) ہیں ان کے لئے استغفار کرتے ہیں خوب سمجھ رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔ (۲۲/ج) نزول قرآن کے موقع پر روئے زمین پر مومنین صرف اور صرف اصحاب رسول ہی تو تھے باقی امت تو بالواسطہ مخاطب ہے۔ صحابہ کرامؓ خود بھی بہت توبہ کرنے والے تھے۔ سورہ انعام میں ہے کہ (اے پیغمبر!) جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو (اے پیغمبر!) تو ان سے کہہ دے کہ تم پر (اللہ کا) سلام ہو۔ تمہارے رب نے تمہارے لئے رحمت کو اپنے ذمے کرلیا ہے تو بلاشبہ تم میں سے جو کوئی بھی نادانی سے برا کام کرے پھر بعد میں توبہ کرے اور نیک ہوجائے تو بے شک وہ بڑا بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے'' (۲۳/الف) بہ حالتِ ایمان اور بحالتِ بیداری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روبہ رو ملاقات کا شرف حاصل کرنے والے صرف اور صرف صحابہ کرامؓ ہی تو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعے انہیں سلام بھیجا ہے تو صرف یہی شرط عائد کی ہے کہ وہ ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس کے بعد اگرچہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی رحمت کو توبہ سے مشروط کردیا ہے لیکن اس سے یہ بھی تو ثابت ہوگیا کہ صحابہ کرامؓ واقعی توبہ کرنے والے لوگ تھے ورنہ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب والشہادۃ ہے، ان مومنین کو صرف اور صرف شرط ایمان پر اپنا سلام ہی

کیوں بھیجتا؟ اس نے پہلے اپنا سلام بھیجا اور پھر پیغام دیا۔ سورہ توبہ میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانوں کو خرید لیا ہے کہ ان (جانوں) کے بدلے میں ان کے لئے جنت ہے، وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں تو وہ (کفار کو) قتل بھی کرتے ہیں اور (ان کے ہاتھوں) قتل ہوتے بھی ہیں، یہ وعدہ اس کے ذمہ ہو چکا (اور اس کا ذکر) تورات وانجیل اور قرآن (ان سب ہی آسمانی کتب) میں ہے اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ سو تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اس سے کرلیا ہے اور یہی وہ بہت بڑی کامیابی ہے''۔ (۲۳/ب) اس کے فوراً بعد ان ہی لوگوں کے متعلق مزید ارشاد ہے کہ یہ لوگ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے (یا راہ حق میں سفر کرنے والے)، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برے کاموں سے منع کرنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں اور تو ان (مومنین) کو خوش خبری سنادے''۔ (۲۳/ج) اور سورۂ تحریم میں ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ سے سچی توبہ کرو بہت ممکن ہے کہ اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کردے اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی۔ جس دن اللہ نبی کو اور اسکے ساتھ جو ایمان لائے ہیں کو رسوا نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا وہ کہتے ہوں گے اے ہمارے رب! ہمارے لئے ہمارے نور کو مکمل فرما اور ہمیں بخش دے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے''۔ (۲۴/الف) یہاں ایمان والوں کو توبہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس کے اولیں مخاطب صحابہ کرام ہی ہیں اور باقی امت تو بالواسطہ مخاطب ہے۔ ان اصحاب کا سچی توبہ کرنا بھی ثابت ہو رہا ہے ورنہ ان کے متعلق یوں نہ فرمایا جاتا کہ بہ روز قیامت اللہ انہیں رسوا نہیں کرے گا۔ صحابہ کرامؓ قیامت کے دن اپنے نور کے آخر تک باقی رہنے اور اس کے مکمل ہونے کی دعا اس دن کی ہول ناکیوں کی وجہ سے کریں گے ورنہ سورہ تحریم کے زیر بحث مضمون میں تو اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا ہے کہ وہ انہیں قیامت کے دن رسوا نہیں کرے گا، پس دعا لوگوں کا قول ہے اور انہیں رسوا نہ کرنے کا قول اللہ تعالیٰ کا ہے اور اللہ سے زیادہ سچی بات اور کس کی ہوسکتی ہے؟ آیت میں والذین اٰمنوا کے ساتھ معہ کی قید سے واضح ہوگیا کہ صحابہ کرامؓ اس کا اولیں مصداق ہیں ورنہ قیامت تک کے عام مسلمان مراد ہوتے تو معہ کی قید کی قطعاً ضرورت ہی نہ تھی۔ بلاضرورت کلام عیب ہے اور اللہ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ تاہم بعد کے ادوار کے وہ اہل ایمان بھی اس میں شامل ہوئے جو عقائد میں ان اصحاب کے نقش قدم پر چلیں اور اپنے گناہوں سے سچی توبہ کریں، کیوں کہ آیت میں توبہ کا حکم عام ہے ورنہ اگر ساری امت مسلمہ بلا امتیاز مراد لی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ کوئی بڑے سے بڑا فاسق بھی جہنم میں نہ جائے گا، حال آں کہ یہ بالاتفاق

غلط ہے ورنہ قرآن کریم میں آیات وعید کا نزول (معاذ اللہ) عبث ہوگا اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ ویسے اگر اللہ چاہے تو کسی مسلمان کو بغیر توبہ کے بھی معاف فرمادے۔ دنیوی زندگی میں توبہ سے تو شرک بھی معاف ہوجاتا ہے، پس سورہ نساء کی جس آیت کا مضمون یہ ہے کہ اللہ شرک کے سوا باقی گناہوں کو جس کے لئے چاہے گا معاف فرمادے گا، اس سے مراد یہی ہے کہ جس کی موت شرک پر واقع ہوگئی اس کی مغفرت نہیں ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ فاسق مومنین کو رسوا کرنے کے لئے نہیں، بل کہ پاک وصاف کرنے کے لئے عذاب ہوسکتا ہے تو جواب یہ ہے کہ گو یہ عذاب حقیقی نہ سہی لیکن بہ ظاہر تو رسوائی ہی ہے۔ آیت کا سیاق وسباق اور مدلول ومفہوم اس طرح کی دور از کار تاویلات کا متحمل نہیں ہے۔ سورہ آل عمران میں نیک لوگوں کی دعا کا ایک حصہ یوں ہے کہ اے ہمارے رب! تو نے جسے آگ میں داخل کردیا تو بے شک تو نے اسے رسوا کردیا (خواہ یہ رسوائی حقیقی ہو یا ظاہری وصوری ہو)''۔ (۲۴/ ب) یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ کا باہم کوئی اختلاف اصولی یا اعتقادی نہ تھا کہ عقائد کے اختلاف سے ان کی مسجدیں، اذانیں اور نمازیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہوں ورنہ سب ہی صحابہ کرامؓ کو مذکورہ بشارت نہ سنائی جاتی۔ ان کے اختلافات انتظامی امور میں تھے یا دین کے ان فروعی مسائل میں تھے جنہیں اجتہادی مسائل کہا جاتا ہے۔ مثلاً امام کے پیچھے مقتدی کا سورہ فاتحہ پڑھنا یا نہ پڑھنا، تکبیر تحریمہ کے بعد نماز میں رفع یدین کرنا یا نہ کرنا، آمین اونچی آواز سے کہنا یا آہستہ کہنا وغیرہ صحابہ کرامؓ سے طبقاتی اور عملی تواتر سے امت کو منتقل ہوئے ہیں۔ ان اختلافات کے باوجود انہیں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ انہیں بہ روز قیامت رسوا نہیں کرے گا۔ پس اس طرح کے فروعی اجتہادی اختلافات میں کسی بھی فریق کی طرف سے تشدد اور غلو کی راہ اختیار کرنا اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں باہم انتشار اور عناد پیدا کرنا مذموم ہے، گو کوئی اسے غلطی سے دینی خدمت سمجھتا ہو۔

بات یہ ہورہی تھی کہ صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ سے بہت توبہ کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان پر نہایت مہربان ہے۔ مثلاً سورہ احزاب میں ہے کہ ''وہ (اللہ) وہی ہے جو تم پر رحمت نازل کرتا ہے اور اس کے فرشتے (تمہارے لئے) دعائے رحمت کرتے ہیں اور وہ مومنین پر نہایت مہربان ہے''۔ (۲۴/ ج) اس آیت کے بہ صیغہ خطاب اولیں مخاطب صحابہ کرامؓ ہی ہیں۔ اور اسی سورہ توبہ میں ہے کہ اللہ نے مومن مردوں اور عورتوں سے جنتوں کا وعدہ فرمالیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں (ان سے) پاکیزہ رہائش گاہوں کا (وعدہ فرمالیا ہے) اور اللہ کی رضامندی (ان) سب سے بڑی ہے، یہی زبردست کامیابی ہے''، (۲۵/ الف) اور اسی سورہ توبہ میں ہے کہ ''جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا وہ اللہ کے ہاں بہت بڑے مرتبے والے

ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو مراد پانے والے ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور اپنی خوش نودی کی اور جنتوں کی بشارت دیتا ہے، ان کے لئے وہاں دائمی نعمت ہے۔ وہاں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں بے شک اللہ کے ہاں (ان لوگوں کے لئے) بہت بڑا اجر ہے"۔ (۲۵/ب) اور اسی سورہ توبہ میں ہے کہ مہاجرین و انصار میں سے جو پہلے پہل (اسلام قبول کرنے والے) ہیں اور جنہوں نے ان کی اچھے طریقے سے پیروی کی ہے، اللہ ان سب سے بلاشبہ راضی ہوگیا اور وہ اس (اللہ) سے راضی ہوگئے۔ اللہ نے ان کے لئے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہوں گی، وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (۲۵/ج) اور اسی سورہ توبہ میں ہے کہ "بے شک اللہ نے نبی پر اور مہاجرین وانصار خصوصی توجہ فرمائی جنہوں نے اس (نبی) کی تنگی کے وقت پیروی کی بعد اس کے کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں تزلزل ہوجاتا پھر اس (اللہ) نے ان پر رحمت سے توجہ فرمائی، بے شک اللہ ان پر نہایت ہی مشفق (اور) نہایت ہی مربان ہے"۔ (۲۶/الف)

صحابہ کرامؓ کے متعلق ان تمام مضامین پر بار بار غور کیجئے۔ صحابہ کرامؓ جو خود بھی بہت توبہ کرنے والے ہوں، اللہ کے رسول کو ان کے لئے استغفار کا حکم ہو اور وہ استغفار کرے، ملائکہ جن کے لئے استغفار کرتے ہوں، آنے والی نسلوں کو جن کے لئے استغفار کا حکم ہو، اللہ بار بار یہ اعلان فرمائے کہ وہ ان پر نہایت ہی مشفق اور نہایت ہی مہربان ہے، جن پر اللہ رحمت نازل کرے اور جن کے لئے ملائکہ دعائے رحمت کریں، جنہیں اللہ رسول کے ذریعہ اپنا سلام پہنچائے، جنہیں بار بار اپنی رضامندی، بخشش اور جنتوں کی بشارت سنائے، جنہوں نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی تھیں انہیں ان کے ایمان کے بقا کی ضمانت دے، غزوہ بدر والوں کے متعلق وہ بتائے کہ ان میں کوئی منافق نہیں تھا اور سب اصحاب رسول اللہ کی راہ میں لڑ رہے تھے، غزوہ احد میں جن سے لغزش ہوئی انہیں معاف فرمائے اور اپنے رسول کے دل کو ان کے لئے نرم فرمائے اور ساتھ ہی رسول کو بھی حکم دے کہ آپ بھی انہیں معاف کردیں اور ان کے لئے استغفار کیا کریں، غزوہ حدیبیہ اور بیعت رضوان والوں کو بے حد وحساب فتوحات وغنائم کی بار بار بشارت سنائے اور انہیں یہ بتائے کہ اللہ تمہارے دلوں کا حال جانتا ہے اسی لئے وہ تمہیں اپنی رضامندی کی بشارت دیتا ہے، جنہیں وہ یہ بشارت سنائے کہ وہ تمہیں ایسے ہی سیدھے راستے پر چلائے رکھنا چاہتا ہے جیسے وہ اپنے رسول کو سیدھی راہ پر چلانا چاہتا ہے (۲۶/ب)، جن کے متعلق وہ یہ اعلان فرمائے کہ وہ ان کو قیامت کے دن رسوا نہیں کرے گا، جن کی بے حد مدح وثنا کے بعد وہ یہ بتائے کہ ان کے اچھے حال سے اللہ کافروں کو چڑانا چاہتا ہے (۲۶/ج)، جو منافقین ان صحابہ کرامؓ پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے تھے ان کے

متعلق اپنے رسول کو یوں بد دعا کرنے کا حکم دے کہ تم اپنے غصے میں مرجاؤ (۲۷/الف)، جو مشرکین ان صحابہ کرامؓ پر طعنہ زنی کرتے تھے ان کے متعلق اللہ یہ کہے کہ یہ لوگ ان (صحابہ کرامؓ) پر نگران نہیں مقرر کئے گئے ہیں (۲۷/ب) جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے انہیں اللہ کہے کہ گو فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں کا درجہ تم سے بہت بلند ہے لیکن اس نے سب سے بھلائی کا وعدہ کرلیا ہے، جو اللہ فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں کی یوں تالیف کرے کہ حنین واوطاس کے غنائم کا بہت بھاری حصہ انہیں دلائے، جنہیں یہ بتایا گیا ہو کہ جن کے لئے اللہ حسنیٰ (بھلائی) کو مقدر فرمائے وہ جہنم کی آواز تک بھی نہیں سننے پائیں گے، جن کا اللہ تعالیٰ منافقین سے کھلا امتیاز یوں کرے کہ اپنے رسول کو کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کا اور ان پر سختی کرنے کا دو مرتبہ تاکیدی حکم دے اور یہ ظاہر فرماوے کہ جس سے اس کے رسول نے آخر تک اپنائیت اور محبت کا رویہ رکھا ہو وہ ہرگز منافق نہیں ہوسکتا وغیرہ وغیرہ، بار بار دہرائے گئے مضامین کے باوجود اگر کوئی زید عدل عدل کی دہائی دیتا رہے، صحابہ کرامؓ کو مطعون کرتا ہوا اس طرح کے کلمات کہے کہ اللہ کے ہاں سکھا شاہی نہیں کہ وہ فلاں فلاں کو سزا دیئے بغیر معاف کردے وغیرہ، تو سخت اندیشہ ہے کہ زید خود ہی عدل خداوندی کا سامنا کرے گا۔ عدل میں اپنا حق پورا لیا جاتا ہے اور دوسرے کو اس کا حق پورا دیا جاتا ہے۔ کون ہے جو اللہ کا حق ادا کرسکے؟ پس اللہ تعالیٰ نے جس سے عدل کیا وہ برباد ہوا اس کا کوئی صغیرہ گناہ بھی صغیرہ نہیں بل کہ سب کبیرہ ہیں اور جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رحمت وشفقت کا سلوک کیا تو اس کا کوئی گناہ کبیرہ نہیں بل کہ صغیرہ بھی نہیں کیوں کہ سب معاف ہوجائیں گے اور اللہ تعالیٰ نے بار بار صحابہ کرامؓ کے لئے رؤف رحیم ہونے اور انہیں اپنے رحمت میں داخل کرلئے کی لوگوں کو خبر دی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے مخالفین کے لئے اس نے رحمۃ اللعالمین ﷺ کو بھی نیک دعا کی اجازت نہیں دی، بل کہ فرمایا کہ انہیں یوں بد دعا دو کہ تم اپنے غصے میں مرجاؤ۔ انہیں یہ بھی سنایا گیا کہ (اے پیغمبر!) تو ان سے کہہ دے کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو تم انہیں روکے رکھتے کہ کہیں یہ خزانے خرچ نہ ہوجائیں اور انسان تو تنگ دل ہے (۲۷/ج)۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی صحابہ کرامؓ (مہاجرین وانصار اور مؤلفۃ القلوب) بعد میں مرتد، منافق، فاسق وفاجر ہوگئے تھے تو کیا اللہ تعالیٰ کو اس کا پہلے سے علم تھا یا نہیں؟ اگر کہا جائے کہ علم نہیں تھا تو یہ بالاتفاق کلمہ کفر ہے۔ یہ یہود ونصاریٰ کا عقیدہ ہوسکتا ہے، کوئی مسلمان اس کا قائل نہیں ہوسکتا۔ بائبل کے بیان کے مطابق اللہ نے آدم کو پیدا کیا بعد میں انسانوں کے کرتوت دیکھے تو (معاذ اللہ) وہ بہت ہی پچھتایا کہ کیسی مخلوق پیدا کر بیٹھا ہوں۔ سموئیل نبیؑ کے زمانے میں اللہ نے ساؤل (طالوت) کو بادشاہ بنایا۔ بعد میں بہ مطابق بائبل

طالوت کے بُرے کام دیکھے تو وہ (معاذ اللہ) بہت نادم ہوا اور سیموئیل سے معذرت کی۔ اگر دوسری شق اختیار کی جائے کہ اللہ تعالیٰ کو صحابہ کرامؓ کے مستقبل میں مبینہ کفر وارتداد یا فسق وفجور کا علم تھا پھر بھی اس نے صحابہ کرامؓ کے متعلق بشارتوں کا قرآن کریم میں ایک انبار لگا دیا تو یہود ونصاریٰ نے تو بہ زبانِ قال اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جھوٹا، دغاباز، عہد شکن وغیرہ کہا ہے، صحابہ کرامؓ کے متعلق ایسی باتیں کرنے والے اگر بہ زبانِ قال نہیں تو یقیناً بہ زبانِ حال اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی سمجھ رہے ہیں۔ یہود ونصاریٰ کے متعلق ہمارا مضمون ''مجنون کون ہے؟'' پڑھ لیجئے (۲۸/الف) پھر فیصلہ کیجئے کہ کیا ہمیں یہود ونصاریٰ کے حال سے عبرت پکڑنی چاہئے یا ان کے نقش قدم پر چلنا چاہئے؟ واللہ یھدی من یشآء الیٰ صراط مستقیم

(ب) سورہ محمد میں منافقین کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے وہ یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے (دلوں کے) کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا؟ اگر ہم چاہتے تو (اے پیغمبر!) ہم تجھے یہ لوگ (کسی ظاہری نشان کے ذریعے) دکھا دیتے اور تو انہیں ان کے چہروں ہی سے پہچان لیا کرتا اور تو یقیناً ان (میں سے بہت سے لوگوں) کو ان کی بات انداز سے ہی پہچان لیا کرے گا اور اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے'' (۲۸/ب) سورہ توبہ میں ہے کہ (یہ) منافقین ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے خلاف کوئی سورت نہ اترے جو ان کے دلوں کی باتیں انہیں بتا دے (اے پیغمبر!) تو (ان سے) کہہ کہ تم مذاق اڑاتے رہو یقیناً اللہ ان تمام باتوں کو ظاہر کرنے والا ہے جن سے تم ڈر رہے ہو۔ (۲۸/ج) سورہ آل عمران میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ تمہیں اسی حال پر رکھے جس پر تم ہو جب تک کہ وہ (غزوہ احد وغیرہ میں پیش آنے والی سخت آزمائشوں کے ذریعے) خبیث (منافق) کو پاکیزہ (مومن) سے الگ نہ کر دے (جو نفاق میں بہت گہرے ہیں کہ اپنی باتوں سے اور آزمائشوں کے ذریعے بھی ظاہر نہ ہوں تو اے مسلمانو!) اللہ تم کو (تو ایسی) غیبی خبروں پر مطلع نہیں کرتا لیکن اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہے (ایسی یقینی غیبی خبریں بتانے کے لئے) چن لیتا ہے'' (۲۹/الف) ان قرآنی مضامین سے بہ خوبی واضح ہوا کہ جو منافقین اسلام اور مسلمانوں کو ادنیٰ سے ادنیٰ بھی کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے، اللہ نے ہرگز انہیں اپنے رسول سے مخفی نہیں رکھا۔ جن کا نفاق مسلمانوں کے لئے ضرر رساں نہیں تھا ان کی اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی ہو یا انہیں بالآخر نفاق سے نجات دے دی ہو، ان کا معاملہ الگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کو خبیث قرار دیا ہے پس منافق عورتیں خبیثات (گندی عورتیں) ہوئیں اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں فرمایا ہے کہ ''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں''۔ (۲۹/ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ پاکیزہ اور کون ہو سکتا ہے، پس آپ کے لائق

صرف اور صرف پاکیزہ عورتیں ہی ہوسکتی ہیں جو بے حیائی سے بھی پاک ہوں اور کفر ونفاق سے بھی پاک ہوں۔ شریعت محمدیہ میں اہل کتاب کی عورتوں کے علاوہ کسی اور مذہب کی کافر عورت سے نکاح درست نہیں۔ منافق بھی کافر ہوتا ہے جو اپنے کفر کو چھپاتا ہے اور بہ نصِ قرآنی وہ خبیث بھی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (اور صحابہ کرامؓ نے بھی) کسی یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح نہیں کیا چہ جائے کہ آپ کسی کافر یا خبیث منافق عورت سے نکاح کرتے۔ ازواج مطہرات کے متعلق یہ بدگمانی کہ وہ منافق تھیں یا بعد میں منافق ہوگئی تھیں، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدترین توہین ہے۔ یہاں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی کافر بیویوں کی مثال دینا قطعاً غلط ہے۔ شریعت محمدیہ کے احکام سابقہ شرائع کے بہت سے احکام سے مختلف ہیں۔ جب منافقین کا نفاق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے مخفی نہیں رکھا اور وقتاً فوقتاً آپ کو ان کے بارے میں بتایا جاتا رہا تو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اے نبی! تو کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور تو ان پر سختی بھی کر، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے''۔ (۲۹/ ج)

جہاد ہمیشہ مسلح قتال کی صورت میں نہیں ہوتا۔ زبان سے یعنی لسانی جہاد بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ منافقین کے خلاف جہاد اور سختی کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی، تو یہ قول اس لئے لغو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص نبی کو ہی مخاطب کر کے منافقین پر سختی کا حکم دیا ہے۔ اگر ایسی کوئی ضرورت پیش نہیں آنی تھیں تو ایسا حکم دینا ہی (معاذ اللہ) بے کار تھا۔ اللہ اور اس کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ القلوب (نومسلم قریش مکہ) پر سختی کرنے کی بہ جائے ان کے گھر اموال غنیمت سے بھر دیئے۔ انصار مدینہ کو کچھ بھی نہ دیا گیا اور مہاجرین کو بھی بہت کم دیا گیا۔ آپ نے اللہ کے حکم سے ان نو مسلموں کی تالیف قلب (دل جوئی) فرمائی۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے اس سے ماضی حال اور مستقبل کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہوتی۔ یہ مؤلفۃ القلوب بعد میں (معاذ اللہ) مرتد، منافق یا فاسق وفاجر ہونے والے ہوتے تو ہرگز ان کے حق میں بشارتیں نہ سنائی جاتیں اور نہ ہی ان کی دل جوئی کا اہتمام کرتے ہوئے ان کے گھر اموال غنیمت سے بھرے جاتے۔ جس طرح برادرانِ یوسفؑ اپنے ظاہری کبائر کے باوجود فاسق نہیں بعینہٖ اسی طرح مؤلفۃ القلوب یا دیگر صحابہ کرامؓ بھی کافر، منافق، مرتد تو کیا فاسق وفاجر بھی نہیں۔ زید اگر سو دو سو آدمیوں کو ناحق قتل کر ڈالے اور بکر اپنے نبی باپ کو سال ہا سال ایذا پہنچائے تو ہر عقلِ سلیم رکھنے والا شخص بکر کے جرم کو زید کے جرم سے کہیں زیادہ بھاری قرار دے گا۔ اس کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ نے برادران یوسفؑ کو مغفور ومرحوم لوگوں میں شامل فرمایا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمارے ہاں اللہ کی رحمت یا اس کے غضب کو ماپنے کے کوئی پیمانے نہیں ہیں۔ جو کوئی بہ زعم خویش ایسے پیمانے وضع کرتا

ہے، خدشہ ہے کہ یہ پیمانے خود اسی کے خلاف استعمال ہوں گے۔

(ج) سورہ حجرات میں ہے کہ ''اگر مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جنگ ہو جائے تو ان میں صلح کرا دیا کرو۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک جماعت دوسری پر زیادتی کرے تو تم اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں تم ان میں صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے''۔ (۳۰/الف) اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں باہم جنگ تک بھی نوبت پہنچ جائے تو اس سے کسی کا کفر لازم نہیں آتا بل کہ اسلامی اخوت بحال رہتی ہے اور اس اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے مسلمان اپنے ان بھائیوں میں دوبارہ میل ملاپ کی ہر ممکن کوشش کریں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چوں کہ اتحاد بین المسلمین مطلوب ومقصود اور تفریق بین المومنین مذموم ومعیوب ہے اس لئے بعد کے ادوار کے مسلمان بھی ایسے ناخوشگوار حوادث و واقعات کی تعبیر وتاویل اس انداز سے کریں کہ ان کا باہم جذبۂ اخوت مجروح ہونے کی بہ جائے قائم ودائم رہے۔ صحابہ کرامؓ کے بارے میں تو یہ تعبیر وتاویل واجب بھی ہے تا کہ قرآن کریم سے ثابت شدہ خبروں سے تطبیق وموافقت پیدا ہو۔ اور اس تمام غلیظ تاریخی مواد کو دیوار پر دے مارنا ہوگا جس سے کتاب اللہ کی محکمات کی تکذیب لازم آتی ہو نہ یہ کہ غلاظت پسند مکھی کی طرح کوئی اس پر گرنے کے لئے بے تاب نہ ہو۔ صرف وہی مواد قابل قبول ہوسکتا ہے جو کتاب اللہ کے مطابق ہو یا کم از کم اس کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ صرف اور صرف کتاب اللہ ہی کو لیا جائے گا جو ہم تک تواتر سے پہنچی ہے۔ اسی میں عافیت ہے۔ احادیث کا بڑا ذخیرہ چند راویوں کے ذریعے آگے منتقل ہونے کی وجہ سے اخبار آحاد پر مشتمل ہے۔ کسی بھی خبر واحد کو قرآن کریم کے قطعی الدلالۃ مضامین کے مقابلے اور معارضے میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسے کتاب اللہ کے تابع کیا جائے گا۔ ظاہری تعارض کی صورت میں خبر واحد کو کتاب اللہ کے مطابق کیا جائے گا۔ اگر یہ تطبیق ممکن نہ ہو یا فریق مخالف ضد اور تعصب یا لاعلمی و بے خبری کی بنا پر اسے قبول نہ کرے تو صرف کتاب اللہ ہی کو لیا جائے گا۔ سورہ حجرات کے زیر بحث مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ مسلمان سے قتل وقتال گناہ کبیرہ ہے جسے بعض احادیث میں تغلیظاً کفر بھی قرار دیا گیا ہے لیکن باغی گروہ سے قتال کا حکم تو خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لہٰذا یہ گناہ نہیں بل کہ شرعاً مطلوب ہے۔ سیدنا حضرت علیؓ نے اپنے مخالفین کو باغی تصور کرتے ہوئے ان کے خلاف قتال کیا، اس لئے ان پر کوئی الزام نہیں۔ سیدنا حضرت علیؓ کا درجہ حضرت معاویہؓ سے بہت بہت بلند ہے۔ وہ حضرت معاویہؓ کو تغلیظاً (سخت لہجہ استعمال

کرتے ہوئے) جو بھی کہیں دوسروں کو ایسا کہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ دورِ علوی کے ہزاروں صحابہ کرامؓ نے بھی حضرت معاویہؓ کو باغی قرار نہیں دیا ورنہ وہ سورۂ حجرات کی متعلقہ آیت کی روشنی میں حضرت علیؓ کا ضرور بالضرور ساتھ دیتے، تفصیل آئندہ سطور میں آرہی ہے۔ نیز حضرت علیؓ بھی حضرت معاویہؓ کو خطائے اجتہادی پر سمجھتے ہوئے انہیں باغی قرار دے رہے تھے۔ نسیان وخطا عنداللہ معاف ہے لیکن قتل خطا کی طرح بغاوتِ خطا پر بھی شرعی احکام دنیا میں مرتب ہوتے ہیں۔ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی مدافعت میں یہ سمجھتے ہوئے قتال کیا کہ مسلمانوں میں فتنہ وفساد اور جنگ وجدال کے حقیقی اور اولیں ذمے دار سنگ دل قاتلینِ عثمانؓ اور ان کے ہم نوا ہیں۔ یہ حقیقی باغی ہیں۔ ان کی اکثریت یمن کے یہودی عبداللہ بن سبا کی پیروکار تھی جو از راہ نفاق اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ یہ کوئی فرضی شخصیت نہیں۔ اس کا تذکرہ امامیہ حضرات کی اسماء الرجال کی مشہور کتاب رجال کشی میں بھی ہے۔ ان لوگوں نے نہ تو مدینہ منورہ کی حرمت کا لحاظ کیا، نہ ہی ذی الحجہ کے مہینے کا احترام کیا کیوں کہ ان ظالم باغیوں نے ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ہجری/ ۱۷ جون ۶۵۶ عیسوی بہ روز جمعۃ المبارک کو حضرت عثمانؓ کو ناحق قتل کرنے کے سفاکانہ جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عثمانؓ کی قرابت اور مثلاً غزوہ تبوک اور دیگر مواقع پر ان کی جلیل القدر دینی خدمات کو بھی ملحوظ نہ رکھا۔ انہوں نے چادر اور چار دیواری کے تقدس کو بھی پامال کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی شہادت سے قبل اپنے خطبات میں ان ظالم وسفاک باغیوں پر حجت پوری کر دی تھی اور انہیں بار بار متنبہ فرمایا تھا کہ تم نے اگر مجھے قتل کر دیا تو واللہ! تمہاری باہم محبت ختم ہو جائے گی اور تم بعد میں اکٹھے نماز نہیں پڑھ سکو گے اور نہ ہی تم اکٹھے ہو کر دشمنوں سے مقابلہ کر سکو گے (۳۰/ ب)۔ ان ہی باغیوں نے فریقین میں مصالحت کے باوجود دھوکے اور شرارت سے جنگ جمل کی آگ بھڑکائی تھی۔ ان ہی باغیوں اور قاتلین عثمانؓ کے خلاف سیدنا حضرت علیؓ نے بددعا کرتے ہوئے فرمایا تھا، تبالهم آخر الدهر، اور بعض روایات میں تباً لهم سائر الدهر ہے، یعنی ان کے لئے عمر بھر کے لئے ہلاکت اور بربادی ہو (۳۰/ ج) نیز آپ نے فرمایا لعن الله قتلة عثمان فی السهل والجبل والبر والبحر (۳۰/ د) یعنی اللہ عثمانؓ کے قاتلوں پر ہر جگہ صاف زمین میں اور پہاڑوں پر، خشکی اور سمندر میں لعنت کرے۔ بدقسمتی سے اس طرح کے فتنہ جو اور شریر لوگ دونوں طرف موجود تھے۔ مثلاً تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہؓ کی فوج میں حضرت عمار بن یاسرؓ کے فتنہ جو قاتل موجود تھے تو دوسری طرف مثلاً شمر ذوالجوشن وہ انجث الخبائث شخص ہے جو سانحہ کربلا کا سب سے بڑا شیطانی کردار ہے۔ یہی شمر جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل تھا (۳۱/ الف) اور مثلاً عمرو بن جرموز بھی جنگ

جمل میں حضرت علیؓ کی فوج میں تھا۔ اس نے حضرت زبیرؓ کو شہید کیا اور آپ کے سر مبارک کو لے کر حضرت علیؓ کے پاس بہ غرض انعام پہنچا اور ملاقات کا خواست گار ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ابن صفیہؓ (حضرت زبیرؓ) کے قاتل کو جہنم کی بشارت سنا دو اور اسے اپنے پاس آنے نہیں دیا (۳۱/ب) جس طرح شمر ذی الجوشن اور عمرو بن جرموز جیسے خبیث الفطرت لوگوں کی وجہ سے حضرت علیؓ اور ان کے مخلص ساتھیوں پر کوئی الزام نہیں آتا بعینہٖ اسی طرح حضرت معاویہؓ کی فوج میں شامل اسی قماش کے لوگوں کی وجہ سے حضرت معاویہؓ اور ان کے مخلص ساتھیوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ حضرت معاویہؓ کا خیال تھا کہ قاتلین عثمانؓ جو اصل باغی ہیں، کسی نہ کسی حیلے سے حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ہیں۔ حضرت معاویہؓ کو خوب یاد تھا کہ انہوں نے ابو مسلم خولانی کے ہاتھ سیدنا حضرت علیؓ کو مراسلہ بھیجا تھا کہ قاتلین عثمانؓ کو ہمارے سپرد کر دیا جائے تو کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ حضرت علیؓ نے ابو مسلم سے کہا کہ آپ کل صبح میرے پاس آئیں اور حکم دیا کہ انہیں نہایت عزت و احترام سے رکھا جائے۔ اگلے روز وہ علی الصبح حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے کوئی دس ہزار سے زائد مسلح لوگوں کو دیکھا جو پکار رہے تھے کہ ہم سب قاتلین عثمان ہیں۔ (۳۱/ج) اس حرکت سے ان لوگوں کی فتنہ جوئی اور اشتعال انگیزی واضح ہو رہی تھی اور حضرت علیؓ کی بے بسی بھی نمایاں تھی۔ ان حالات میں حضرت معاویہؓ اپنی دانست میں یہ سمجھنے میں حق بہ جانب تھے کہ حضرت علیؓ سے مدافعت میں لڑی جانے والی جنگ دراصل ان باغیوں کے خلاف بھی ہے جن سے خون عثمانؓ کا قصاص لینے کو وہ وقت کی اولیں ضرورت قرار دیتے تھے لہٰذا حضرت معاویہؓ پر بھی چنداں الزام عائد نہیں ہوتا۔ دونوں فریق اپنی اپنی دانست میں حق پر تھے۔ سورۂ فتح کے آخر میں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی کفار پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ آپس میں مہربان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت کی تعزیرات اور حدود کا نظام معطل یا منسوخ ہو گیا تھا، اس لئے دورِ علوی میں بعض صحابہ کرامؓ کے باہم مشاجرات پر کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اشکال اس لئے بھی پیدا نہیں ہوتا کہ صحابہ کرامؓ آپس کے سیاسی اور انتظامی اختلافات کے باوجود کفار کے مقابلے میں ہمیشہ باہمی متحد اور ایک دوسرے پر مہربان رہے۔ سورۂ فتح کے زیر حوالہ مضمون میں بھی کفار پر سخت ہونے کے مقابلے میں صحابہ کرامؓ کے باہم مہربان ہونے کا ذکر ہے۔ یہ قرآنی خبر ہمیشہ خارجی حقائق کے مطابق رہی۔ اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ آنے والی نسلوں کے لئے بھی عمدہ مثال قائم کر گئے۔ قیصر روم نے سیدنا حضرت علیؓ کے مقابلے میں امیر معاویہؓ کو مالی اور فوجی مدد کی پیش کش کی جسے انہوں نے نہایت ہی حقارت اور درشتی سے ٹھکراتے ہوئے قیصر روم کو نہایت سخت لہجے میں تہدید آمیز خط لکھا کہ اگر تو نے ایسا کوئی ناپاک ارادہ کیا تو میں اپنے بھائی علیؓ سے صلح کر لوں گا اور

ہم دونوں متحد ہو کر تجھے تباہ و برباد اور خستہ حال کر دیں گے۔ (۳۱/ د) یہ اشکال اس لئے بھی پیدا نہیں ہوتا کہ دورِ علوی کی خانہ جنگی میں صحابۂ کرامؓ کی بہت بھاری اکثریت غیر جانب دار رہی، جیسا کہ آئندہ سطور میں آرہا ہے۔ یہ اشکال اس لئے بھی پیدا نہیں ہوتا کہ سیدنا حضرت علیؓ نے اپنے مخالفین و محاربین کو ہرگز غیر مسلم قرار نہیں دیا، آپ نے یوم جمل اور یوم صفین میں کسی کو اپنے خلاف محاربین کے بارے میں یہ کہتے سنا کہ یہ لوگ کافر ہیں تو آپ نے فرمایا یوں نہ کہو۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے سمجھا کہ ہم نے ان پر زیادتی کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے حقوق سے تجاوز کیا ہے۔ (۳۱/ ھ) ابن عساکرؒ نے لکھا ہے کہ امیر معاویہؓ کی جماعت کے کچھ زخمیوں کو سیدنا علیؓ کے ساتھیوں نے قیدی بنالیا۔ ان میں سے جب بعض کا انتقال ہوا تو حضرت علیؓ کی طرف سے انہیں غسل اور کفن دیا گیا اور ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی (۳۲/ الف) سیف بن عمر وضبی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے جس طرح اپنی جماعت کے مقتولین پر نماز جنازہ پڑھی اسی طرح اپنے مخالف فریق کے مقتولوں پر بھی نماز جنازہ پڑھی۔ ان لوگوں میں اہل بصرہ، اہل کوفہ اور مکہ و مکرمہ کے بعض قریشی یعنی سب ہی حضرات شامل تھے (۳۲/ ب) حضرت علیؓ نے صفین کے مقتولین کے متعلق فرمایا قتلانا وقتلاهم فی الجنة (۳۲/ ج) یعنی ہمارے اور ان کے مقتولین جنت میں جائیں گے۔ نعیم بن ابی ہند اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ میں صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھا کہ نماز کا وقت ہو گیا تو ہم نے اور فریق مقابل نے اپنی اپنی جگہ اذان کہی، ہم نے نماز کے لئے اقامت کہی اور نماز باجماعت ادا کی۔ نماز کے بعد ہم لوگوں کے سامنے یہ منظر تھا کہ ہمارے اور ان کے درمیان جنگ صفین کے مقتولین پڑے تھے۔ میں نے حضرت علیؓ سے ان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے اور ان کے مقتولین میں سے جو بھی اللہ کی رضا اور آخرت کا طالب تھا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (۳۳/ الف) جنگ صفین کے سلسلے میں حضرت علیؓ نے اپنے علاقے کے شہروں میں ایک گشتی مراسلہ بھیجا جس میں آپ نے اہل شام کے ساتھ جنگ کی حقیقت یوں واضح فرمائی ''ہمارے اس کام کی ابتدا یہ ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا اور ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا دین ایک ہے۔ ہماری اور ان کی دعوتِ اسلام ایک ہے۔ ہم ان سے اللہ پر ایمان اور رسول کی تصدیق میں کسی زائد چیز کا مطالبہ نہیں کرتے اور نہ ہی وہ ہم سے کسی زائد چیز کا مطالبہ کرتے ہیں تو معاملہ ایک ہی ہے ہمارا اختلاف تو صرف خون عثمانؓ کی بابت ہے اور ہم اس سے بری ہیں۔ (۳۳/ ب) نہج البلاغہ کے اس مضمون سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ سیدنا حضرت علیؓ کسی ایسے عقیدۂ امامت کے ہرگز قائل نہیں تھے جس کا ماننا ہر کسی پر فرض ہو اور جو مسلمہ ایمانیات میں داخل ہو، ورنہ آپ ہرگز یہ نہ فرماتے کہ ہم اہل شام سے ایمان میں کسی زائد چیز کا مطالبہ نہیں

کرتے۔ حضرت علیؓ نے جنگ صفین سے واپسی پر فرمایا کہ اے لوگو! تم امارتِ معاویہ کو برا نہ سمجھو کیوں کہ اگر وہ نہ ہوئے تو تم سروں کو حنظل (تمے) کی طرح ان کے شانوں سے گرتے دیکھو گے۔ (۳۳/ج) ان تمام امور سے واضح ہو رہا ہے کہ کفار کے مقابلے میں صحابہ کرام کے باہم مہربان ہونے کی صفت ہرگز متاثر نہیں ہوئی۔

بعض اوقات دو بالکل متضاد عمل اپنی الگ الگ حیثیت سے درست ہوتے ہیں۔ مثلاً غزوہ بنی نضیر کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ یہودیوں کے کھجور کے باغات کاٹے جائیں تاکہ قلعہ بند محصور یہودی اپنا نقصان ہوتا دیکھ کر شکست قبول کریں اور محاصرہ ختم ہو۔ صحابہ کرامؓ میں سے کچھ نے اس حکم کی تعمیل کی اور کچھ نے تعمیل نہیں کی۔ جنہوں نے تعمیل کی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھ کر کی لہٰذا اس حیثیت سے وہ حق پر ہیں اور جنہوں نے تعمیل نہیں کی انہوں نے سوچا کہ کھجور کے جو درخت کٹ چکے ہیں ان سے یہودیوں کو مرعوب کرنے کا مقصد پورا ہو چکا اور باقی ماندہ درخت بعد میں مسلمانوں کے ہی کام آئیں گے۔ ان حضرات کی نیت بھی نیک تھی لہٰذا یہ بھی حق پر ہیں۔

غزوہ بنی قریظہ کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ فوراً یہودیوں کا محاصرہ کیا جائے راستے میں کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے لیکن کچھ حضرات نے اس کے باوجود جلدی جلدی عصر کی نماز پڑھ لی اور محاصرے میں شریک ہوئے۔ انہوں نے بہ ظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی صریح خلاف ورزی کی لیکن ان کا خیال تھا کہ نماز تو فرض ہے آپ کا مقصد محاصرے میں جلدی کرنا ہے نماز سے روکنا مقصود نہیں ہے۔ آپ نے فریقین میں سے کسی کو بھی ملامت نہیں فرمائی۔ یعنی دونوں فریق اپنی اپنی نیک نیت کے مطابق اپنی دانست میں حق پر تھے، حال آں کہ عمل دونوں کا متضاد ہے۔ بعینہٖ خون عثمانؓ کے بارے میں حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ خلافت پہلے مستحکم ہو قصاص کا معاملہ بعد میں اٹھایا جائے۔ حضرت معاویہؓ کا خیال تھا کہ قاتلین عثمانؓ اگر اسی طرح دندناتے پھرتے رہے تو آئندہ بھی امت مسلمہ کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوں گے، لہٰذا سب سے پہلے ان کی سرکوبی ہونی چاہئے۔ اگر حضرت علیؓ ان سے قصاص لینے میں بے بس ہیں تو درمیان سے ہٹ جائیں ہم خود ان کی سرکوبی کریں گے۔ یوں وہ اپنے آپ کو حق بہ جانب سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں پر بڑا کرم کیا اور اپنے فضل و کرم سے دونوں کو ہر طرح کے الزام سے بری کر دیا۔ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تمام معاملات ہوتے تو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ''اقضاہم علی'' تھے، یعنی عدالتی امور میں سب سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے والا علیؓ ہے۔ شرعی شہادتوں اور تقاضوں کے تحت کسی ایک بھی قاتل سے شاید قصاص

نہ لیا جاسکتا، کیوں کہ حضرت عثمانؓ کا قتل ایک بلوے کی صورت میں ہوا تھا اور صحیح قاتلینِ عثمانؓ کی شرعی تقاضوں کے تحت پوری پوری شناخت تقریباً ناممکن تھی۔ قتلِ عثمان میں جن لوگوں کا نام لیا جارہا تھا وہ حضرت علیؓ کے سامنے ازخود اعترافِ جرم کے لئے تیار نہیں تھے، ان پر تشدد روا رکھ کر ان سے اعترافِ جرم کرانا حضرت علیؓ کے نزدیک شرعاً درست نہیں تھا کہ اس سے بے قصور بھی زد میں آتا اور ایسے اعتراف کی کوئی قانونی حیثیت بھی نہیں۔ ان کی فوج کے ہزاروں آدمیوں کا امیر معاویہؓ کے قاصد کے سامنے یہ پکارنا کہ ہم سب قاتلینِ عثمان ہیں، محض اشتعال انگیزی تھا۔ کسی بھی ملزم کو جب تک عدالتی کارروائی کے تحت باقاعدہ مجرم قرار نہ دیا جائے تو وہ مجرم نہیں بن جاتا اور نہ ہی ان سے مجرموں جیسا سلوک کیا جانا چاہئے۔ اشترنخعی وغیرہ جیسے لوگوں سے حضرت علیؓ کا رویہ اسی وجہ سے مخاصمانہ نہیں تھا۔ حضرت علیؓ کے برعکس حضرت معاویہؓ سراسر انتظامی سوچ کے حامل تھے ان کا خیال تھا کہ قاتلینِ عثمانؓ ہرگز کسی مہلت اور ڈھیل کے مستحق نہیں ہیں اس لئے جس پر اس گھناؤنے جرم کا ادنیٰ سا بھی شبہ ہو اس کا فوری مؤاخذہ کرنے کے وہ درپے تھے۔ جب قوانینِ شریعت ان فتنہ جو لوگوں کا موٴاخذہ نہ کرسکے تو قوانینِ فطرت حرکت میں آگئے۔ دونوں طرف کے فتنہ جو لوگوں نے مصالحت کی مخلصانہ مساعی کو ناکام بنایا اور انہوں نے اشتعال انگیزیوں کو خوب ہوا دی اور یہ لوگ اپنی مرضی سے باہم کشت وخون میں ملوث ہوئے اور دونوں طرف اسی قماش کے لوگوں کی اکثریت دنیا ہی میں اپنے انجام کو ازخود پہنچ گئی لہٰذا ان جنگوں میں مقتولین کی تعداد اگرچہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے لیکن اس سے پریشان ہونے اور صحابہ کرامؓ کو ناحق بدنام کرنے کی کوئی گنجایش نہیں۔ ان فتنہ جو لوگوں کا اخروی معاملہ اللہ کے سپرد ہے، وہ جسے چاہے معاف کرے اور جس کا چاہے مواخذہ کرے۔ اس طرح کے جو لوگ جنگوں سے بچ گئے تو بعد میں اللہ تعالیٰ نے سبائیوں اور قاتلینِ عثمانؓ پر ابن زیاد اور حجاج بن یوسف جیسے ظالم لوگ مسلط کردیئے اور نواصب پر مختار ثقفی اور توابین جیسے لوگوں کو مسلط کردیا۔ نواصب وہ لوگ ہیں جو حضرت معاویہؓ کے تو حامی تھے لیکن سیدنا حضرت علیؓ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے ناحق اپنے دلوں میں کینہ رکھتے تھے۔ بعض نیک لوگوں کو ان ظالم حکمرانوں سے تکالیف پہنچیں خصوصاً سانحہ کربلا نہایت دردناک اور افسوس ناک ہے تاہم فتنہ جو مفسدین خصوصاً ان کی زد میں آئے۔ قرآن کریم میں ہے کہ فتنے (میں شامل ہونے یا اسے نظرانداز کرنے) سے بچو کہ اس کا نقصان صرف ان ہی لوگوں کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں (۳۴/الف) فطرت کے تعزیری قوانین ان مفسدوں کا مواخذہ نہ کرتے تو امت مسلمہ کو مزید ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا۔ بعض ناخوشگوار حوادث کا مثبت پہلو بھی ہوتا ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ مثلاً غزوہ مریسیع کے ایام میں حضرت عائشہ صدیقہؓ پر

منافقین کی ریشہ دوانی سے جو بہتان عائد ہوا تھا، ایک نہایت ہی دل خراش حادثہ تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو کوئی ایک ماہ تک سخت الجھن اور پریشانی میں ڈالے رکھا۔ خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہؓ پر اس بہتان کا اتنا شدید اثر ہوا کہ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ دن رات رونے دھونے میں گزرنے لگے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''یہ لوگ جو (حضرت عائشہؓ پر) بہت بڑا بہتان باندھ لائے ہیں یہ تم میں سے ہی ایک گروہ ہے تم اس سانحے کو اپنے لئے برا نہ سمجھو بل کہ یہ تمہارے لئے اچھا ہے، ان میں سے ہر شخص پر اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا ہے اور ان میں سے جس نے اس کے بہت بڑے حصے کو سرانجام دیا ہے اس کے لئے عذاب بھی بہت ہی بڑا ہے اس بہتان کو سنتے ہی مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے دلوں میں اچھی رائے کیوں نہ قائم کی اور کیوں نہ یہ کہہ دیا کہ یہ تو (حضرت عائشہ صدیقہؓ پر) کھلا بہتان ہے'' (۲۴/ب)۔ پس جس طرح واقعہ افک کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس سے حضرت عائشہؓ کی برأت میں جو قرآنی آیات نازل ہوئیں مسلمان تا قیامت ان کی تلاوت کرتے رہیں گے۔ لعان اور حد قذف کے شرعی احکام لوگوں کو معلوم ہوئے۔ منافقین اپنے عزائم میں ناکام و نامراد ہوئے۔ جن لوگوں کو واقعہ افک سے صدمہ پہنچا ان کے لئے اُخروی اجر بھی پختہ ہو گیا وغیرہ۔ اسی طرح جنگ جمل اور جنگ صفین جیسے حوادث سے فتنہ جو خود اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں بھسم ہوئے۔ مسلمانوں کو باہمی جنگوں سے متعلق صحابہ کرامؓ خصوصاً سیدنا حضرت علیؓ کے طرز عمل سے بہت سے فقہی احکام معلوم ہوئے جو ان جنگوں سے قبل مخفی اور پوشیدہ تھے۔ ان جنگوں میں کسی کو غلام اور لونڈی نہیں بنایا گیا نہ کسی کے مال کو بہ طور غنیمت حاصل کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے مقتولین کی نماز جنازہ بلا امتیاز پڑھائی کسی کو انہوں نے کافر قرار نہیں دیا حتیٰ کہ خوارج تک کو انہوں نے گم راہ تو قرار دیا اور ان کی گم راہی دینی گم راہی تھی لیکن ان میں سے بھی کسی کو غلام اور لونڈی نہیں بنایا گیا نہ ان کے اموال کو مال غنیمت قرار دیا۔ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق تو انہوں نے صاف واضح فرما دیا کہ ان سے ہمارا کوئی دینی اختلاف ہرگز نہیں صرف دم عثمانؓ کے انتظامی مسئلے پر باہم اختلاف ہوا۔ ان جنگوں کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ اصحاب رسول کے متعلق بعد کے ادوار کے مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالا گیا کہ کون اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ان کے لئے استغفار کرتا ہے اور کون ان کے خلاف بغض اور کینہ رکھتا ہے کیوں کہ اگر وہ معصوم عن الخطا ہوتے تو ان کے لئے استغفار کی حاجت ہی کیا تھی؟ اور اگر ان کے درمیان یہ حوادث رونما نہ ہوئے ہوتے تو ان سے بغض و نفرت کا سرے سے کوئی سبب نہ ہوتا حال آں کہ سورہ حشر میں صحابہ کرامؓ کے لئے استغفار اور ان کے خلاف دلوں میں کینہ نہ ہونے کی ہمیں دعا سکھائی گئی ہے۔ ان جنگوں میں فریقین کے جو نیک لوگ

مقتول ہوئے وہ درجہ شہادت کو پہنچ گئے جیسا کہ حضرت علیؓ کا قول قبل ازیں مذکور ہو چکا ہے۔ یہ فائدہ بھی ہوا کہ حضرت علیؓ نے قاتلینِ عثمانؓ کے لئے جو بددعا فرمائی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے شرف قبولیت بخشا اور ان کی بڑی تعداد ان جنگوں اور بعد کے حوادث میں لقمۂ اجل بنی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ بہتان کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ مسلمانوں کو اچھی رائے قائم کرتے ہوئے فوراً کہہ دینا چاہئے تھا کہ یہ تو صریح جھوٹ ہے۔ اس سے یہ سبق ملا کہ جنگ جمل اور جنگ صفین کے سلسلے میں بھی صحابہ کرامؓ کے متعلق حسنِ ظن شرعاً واجب ہے ان کے خلاف جو غلیظ تاریخی مواد یا روایات ہوں انہیں جھوٹ قرار دینا چاہئے کتاب اللہ کی صحابہ کرامؓ کے حق میں محکم آیات سے جو کچھ بھی مُعارض مواد ہوگا اس کے متعلق کسی تحقیق کی قطعاً ضرورت نہیں اسے فوراً مردود قرار دینا چاہئے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان جنگوں میں صحابہ کرامؓ کے تعداد آٹے میں نمک کے بھی برابر نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اسماعیل بن علیہ اور انہوں نے امام محمد بن سیرین سے نقل کیا ہے کہ (خلافتِ علوی) میں فتنے اٹھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دسیوں ہزار اصحاب زندہ تھے مگر ان جنگوں میں ایک سو بھی شریک نہ ہوئے بل کہ تیس تک بھی ان کی تعداد نہیں پہنچتی۔ سیدنا حضرت علیؓ کی فوج میں بہت سے بدری اور اصحاب حدیبیہ کی شرکت کا دعویٰ مخدوش ہے۔ فتنوں کے اس دور میں صحابہؓ کی اکثریت غیر جانبدار رہی جن میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور سعیدؓ بن زید جیسے اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی بھی ہیں۔ جب حضرت علیؓ نے مدینے سے بصرہ جانے کا ارادہ کیا تو اہل مدینہ میں سے بہت کم لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ شعبیؒ کا قول ہے کہ آپ کے ساتھ اصحاب بدر میں سے صرف چھ حضرات تھے اور بعض نے ان کی تعداد چار بتائی ہے (۳۴/ ج)۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے امیہ بن خلد نے بیان کیا کہ اس نے شعبہ سے کہا کہ ابو شیبہ نے حکم سے اور اس نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت کی ہے کہ صفین کی جنگ میں ستر بدری صحابی تھے تو شعبہ نے کہا کہ ابو شیبہ نے غلط کہا ہے۔ اللہ کی قسم ہم نے اس معاملے پر توجہ کی تو ہمیں اہل بدر میں سے سوائے خزیمہؓ بن ثابت کے اور کوئی نہیں ملا اور کہا گیا ہے کہ اہل بدر میں سے چھ آدمی بہ شمول حضرت ابو ایوب انصاریؓ شامل ہوئے اور ابن بطہ نے بکیر بن الاشج کی سند سے یہ بیان کیا ہے کہ شہادتِ عثمانؓ کے بعد اہل بدر گھروں ہی سے چپٹے رہے اور مرتے دم تک گھروں سے باہر نہیں نکلے (یعنی مسلمانوں کی خانہ جنگی میں شریک نہیں ہوئے)۔ (۳۵/ الف)

(د) اوپر بتایا جا چکا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کا موقف اپنی اپنی جگہ پر درست ہے۔ یہاں اختلاف صحیح اور غلط کا نہیں بل کہ اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا تھا۔ بعض اوقات اجتہادی امور میں

اولیٰ اور خلاف اولیٰ کا فیصلہ دشوار ہوا کرتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے قوم کی گوسالہ پرستی کے معاملے میں کوہ طور سے واپس آتے ہی اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو ان کی ریش مبارک سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت ہارونؑ سے قوم کی نگرانی کما حقہ نہیں ہوسکی۔ حضرت ہارونؑ نے اپنا موقف بیان کیا تو حضرت موسیٰؑ نے صرف اپنے لئے ہی نہیں، بل کہ حضرت ہارونؑ کے لئے بھی اللہ سے معافی مانگی (۳۵/ب) کہ جس نے بھی خلاف اولیٰ صورت اختیار کی ہے اللہ اسے معاف کرے۔ دیکھئے اولیٰ اور خلاف اولیٰ کا یقینی فیصلہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر رسول بھی نہ کر سکے۔ حضرت علیؓ کے اہل شام کے بارے میں موقف کے سو فیصد صحیح ہونے کا صحابہ کرامؓ کو یقین ہوتا تو وہ ضرور بالضرور بہت بڑی تعداد میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیتے۔ اگر انہیں امیر معاویہؓ کا موقف سو فیصد درست نظر آتا تو وہ ان کی حمایت کرتے بل کہ فریقین میں سے کسی ایک کے موقف کے درست ہونے کا انہیں ظن غالب بھی ہوتا تو بھی وہ ہرگز غیر جانب دار نہ رہتے کیوں کہ عمل کے لئے یقین قطعی نہ ہو تو ظن غالب بھی کافی ہے۔ ہمارے جن اکابر نے ان جنگوں میں حضرت علیؓ کو حق پر اور حضرت معاویہؓ کو اجتہادی خطا پر قرار دیا ہے، ہماری ناقص رائے میں ان سے تسامح ہوا ہے۔ گزشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عشرہ مبشرہ میں شامل بعض صحابہ کرامؓ اور اہل بدر کی بڑی اکثریت ان جنگوں میں غیر جانبدار رہی حال آں کہ یہ حضرات ہم سے کہیں زیادہ بہتر حیثیت اور حالت میں تھے کہ وہ فریقین میں سے ایک کے حق پر اور دوسرے فریق کے غلطی پر قائم ہونے کا فیصلہ صادر فرماتے۔ جنگ صفین میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت علیؓ کی طرف سے لڑ رہے تھے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔ جنگ صفین میں حضرت عمارؓ کی شہادت سے ہمارے حضرات کو زبردست غلطی لگی کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کو خطائے اجتہادی کا مرتکب اور اس سے بھی آگے بڑھ کر باغی قرار دے ڈالا۔ ان جنگوں کے ایام میں صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی تعداد موجود تھی انہیں اگر یقین یا ظن غالب حاصل ہو جاتا کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے مخلص ساتھی اسی باغی گروہ میں شامل ہیں جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا تھا تو خوب غور کیجئے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ غیر جانب دار صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ کے ساتھ مل کر امیر معاویہؓ کے خلاف قتال نہ کرتے، حال آں کہ سورہ حجرات میں صاف حکم موجود ہے کہ محارب فریقین میں سے جو حق پر ہے اس کے ساتھ مل کر باغی فریق سے جنگ کی جائے۔ اگر حضرت معاویہؓ کی فوج میں فتنہ جو اور مفسد موجود ہوں جیسے حضرت علیؓ کے لشکر میں بھی ایسے لوگ موجود تھے اور انہوں نے حضرت عمارؓ کو شہید کیا ہو تو اس سے حضرت معاویہؓ اور ان کے مخلص ساتھی کیوں کر باغی قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے

لشکر کے ایک شخص عمرو بن جرموز نے حضرت زبیرؓ کو شہید کر ڈالا تو کون ہے جو حضرت علیؓ کو باغی قرار دینے کی جسارت کرے؟ شمر ذوالجوشن جیسا خبیث شخص بھی مورخین کی تصریح کے مطابق جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھا۔ وہ اپنے محارب فریق پر کوئی پھول برسانے تو نہیں آیا تھا۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے حضرت علیؓ اور ان کے مخلص ساتھیوں پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ الغرض جب صحابہ کرامؓ نے معلوم العاقبہ ہونے کے باوجود حضرت معاویہؓ کو باغی قرار دے کر حضرت علیؓ کا جنگ میں ساتھ نہیں دیا تو بعد کے لوگ جو اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبہ ہیں وہ حضرت معاویہؓ کو باغی قرار دینے میں کیسے حق بہ جانب ہو سکتے ہیں؟ بہ روایت امام احمد بن حنبلؒ دورِ علوی میں دسیوں ہزار صحابہ کرامؓ میں سے بہ مشکل تیس حضرات نے خانہ جنگی میں حصہ لیا۔ باقی سب کے سب غیر جانب دار رہے انہیں سیدنا حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب اور ان کے استحقاقِ خلافت سے ہرگز انکار نہیں تھا۔ خود حضرت معاویہؓ بھی ہرگز اس کے منکر نہیں تھے۔ فضائل و مناقب کے اعتبار سے حضرت معاویہؓ کی حضرت علیؓ کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں۔ لیکن کبھی یہ بھی تو ہوتا ہے کہ افضل کی رائے مرجرح اور مفضول کی راجح ہوتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کون افضل ہو سکتا ہے؟ لیکن مثلاً غزوہ بدر کے قیدیوں اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے جنازے کے معاملے میں حضرت عمرؓ کی رائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک راجح تھی۔ جمع وتدوین قرآن کے معاملے میں حضرت عمرؓ کی رائے راجح تھی حضرت ابوبکرؓ تو پہلے پہل پس وپیش سے کام لے رہے تھے حالانکہ حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف دراصل عدلیہ اور انتظامیہ کا اختلاف ہے۔ اگرچہ عدلیہ کو انتظامیہ پر ترجیح حاصل ہے لیکن بعض مخصوص حالات میں انتظامی تقاضوں کو راجح قرار دینے کی مثالیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے بھی ملتی ہیں۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی آئے دن کی خلافِ اسلام ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے تناظر میں حضرت عمر فاروقؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ اسے قتل کرا دیا جائے لیکن آپ نے یہ کہتے ہوئے مشورہ قبول نہ فرمایا کہ مخالفینِ اسلام کو شور مچانے کا موقع ملے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو قتل کراتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے عدل وانصاف پر مبنی تھی اور آپ کی نظر انتظامی مصالح پر تھی۔ فتح مکہ کے ایام میں آپ نے حضرت عائشہؓ کے سامنے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر بالکل اسی طرز پر از سرِ نو ہونی چاہئے جس پر اسے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ نے تعمیر کیا تھا لیکن آپ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ تیری قوم نے نیا نیا اسلام قبول کیا ہے یہ لوگ میرے اس اقدام سے پریشان ہوں گے۔ آپ نے یہاں بھی انتظامی مصلحت کو ترجیح دی۔ اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کے

اختلاف میں فریقین حق پر ہوتے ہیں مثلاً حضرت داؤدؑ کے زمانے میں ایک قوم کی بکریاں کسی کا سارا کھیت چر گئیں۔ کھیت کی فصل کی قیمت بکریوں کی قیمت کے برابر تھی لہٰذا حضرت داؤدؑ نے بکریاں کھیت کے مالک کو دلانے کا فیصلہ فرمایا۔ حضرت سلیمان نے یہ رائے دی کہ بکریوں والے اپنی بکریاں عبوری مدت کے لئے کھیت کے مالک کو دیں اور خود اس کھیت کو کاشت کریں۔ جب فصل حسب سابق ہو جائے تو اپنی بکریاں لے کر کھیت کو مالک کے حوالے کریں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں حضرات کے علم اور فیصلے کی مدح فرمائی لیکن حضرت سلیمان کے فیصلے کو اولیٰ قرار دیا (۳۵/ ج) لیکن بسا اوقات اولیٰ اور خلاف اولیٰ کا فیصلہ اتنا آسان نہیں ہوا کرتا۔ قاتلین عثمانؓ کے بارے میں سیدنا حضرت علیؓ نے عدل وانصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا۔ اگرچہ شرعی شہادتوں اور باقاعدہ عدالتی کاروائی کے بغیر انہیں مجرم تو قرار نہیں دیا جا سکتا تھا لیکن جن لوگوں پر اتنے گھناؤنے جرم میں ملوث ہونے کے قوی شبہات ہوں انہیں انتظامی مناصب پر متعین کرنا بہ ظاہر انتظام اور امن وامان کی بحالی کے تقاضوں کے سراسر خلاف تھا۔ حضرت علیؓ نے محمد بن ابی بکر اور اشتر بن مالک نخعی جیسے متنازعہ لوگوں کو عامل بنا دیا۔ اس سے حضرت معاویہؓ اور اہل شام کا پریشان اور معترض ہونا ایک فطری امر تھا۔ سیدنا حضرت علیؓ کے علم وتقویٰ اور مقام ومنصب کے پیش نظر ان کے خلاف بلاشبہ کسی بدگمانی کی گنجائش نہیں لیکن صحابہ کرامؓ کی عظیم اکثریت نے یہ پسند نہیں کیا کہ جن لوگوں پر حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے کے ظالمانہ اقدام میں ملوث ہونے کے قوی شبہات اور خدشات ہیں، انہیں یوں نوازا جائے۔ دوسری طرف اگر وہ حضرت معاویہؓ کے موقف کو ہر لحاظ سے اولیٰ سمجھتے تو بھی غیر جانب دار رہنے کی بہ جائے یقیناً ان کا ساتھ دیتے لیکن اولیٰ اور غیر اولیٰ میں فیصلہ نہ کر پانے کی وجہ سے غیر جانب دار رہنے پر وہ مجبور تھے۔ جب یہ واضح ہو چکا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں میں سے کسی کے بھی موقف کو قطعیت سے خلاف اولیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا تو ہمارے جن حضرات نے حضرت معاویہؓ کو خطائے اجتہادی پر قرار دیا ہے اور اپنی دانست میں ان کے موقف کو غلط یا کم از کم خلاف اولیٰ سمجھا ہے، وہ خود خطائے اجتہادی کا شکار ہوئے ہیں۔ اگر حضرت معاویہؓ کی رائے کا غلط یا خلاف اولیٰ ہونا قطعیت یا اعلیٰ درجے کے ظن غالب سے ثابت ہوتا تو (معاذ اللہ) یہ کہنا پڑے گا کہ ہزاروں صحابہ کرامؓ نے حضرت علیؓ کا ساتھ نہ دے کر باغیوں کے خلاف قتال کے اس حکم پر عمل نہیں فرمایا جو سورہ حجرات کی متعلقہ آیت میں موجود ہے۔ اگر اس حکم کو امرِ وجوبی کی بہ جائے امرِ استحبابی ہی قرار دیا جائے تو بھی ان پر ترکِ واجب کا نہیں تو ترکِ استحباب کا الزام تو یقیناً عائد ہوگا، حال آں کہ ایسا الزام قطعاً غلط ہے۔ ادھر جو لوگ حضرت علیؓ یا حضرت معاویہؓ پر طعنہ زنی کرتے ہیں انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ان دونوں حضرات میں ۴۰ ہجری

۶۶۰ عیسوی میں صلح ہوگئی تھی۔ پھر ربیع الاول ۴۱ ہجری/ جولائی ۶۶۱ عیسوی میں سیدنا حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ سے باقاعدہ صلح کرلی اور ان کے حق میں دست بردار ہوگئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسے سیدنا حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا تھا کہ میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔ اس طرح نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سیدنا حضرت حسنؓ کے حق میں پوری ہوئی بل کہ سیدنا حضرت حسنؓ نے اپنے حکیمانہ طرز عمل سے بعد والوں میں سے کسی کے لئے بھی صحابہ کرامؓ پر طعن وتشنیع کی کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دی۔ اس مصالحت کو ناپسند کرتے ہوئے جس نام نہاد شیعانِ علی نے آپ کو زخمی کیا اور آپ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) مُذل المومنین (مسلمانوں کو ذلیل کرنے والا) کہا وہ ہرگز سچے شیعانِ علیؓ نہیں ہوسکتے۔ بالفرض اس صلح کے باوجود فریقین کے ساتھیوں کے دلوں میں کوئی رنجش باقی رہ گئی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سورہ حجر میں ہے کہ ہم ان (جنتیوں) کے دلوں میں جو کدورت ہوگی اسے نکال کر صاف کردیں گے (گویا) بھائی بھائی تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ نہ انہیں وہاں کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی وہاں سے نکالے جائیں گے (۳۶/الف) اور سورہ اعراف میں ہے کہ جو کینے ان (جنتیوں) کے سینوں میں ہوں گے ہم سب نکال ڈالیں گے۔ ان کے (محلوں) کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں یہاں کا راستہ دکھایا اور اگر اللہ ہمیں یہ راستہ نہ دکھاتا تو ہم راستہ نہ پاسکتے۔ بے شک ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے اور اس دن منادی کردی جائے گی کہ تم ان اعمال کے صلے میں جو تم (دنیا میں) کرتے تھے، اس جنت کے وارث بنادیئے گئے ہو۔ (۳۶/ب) ظاہر ہے کہ اگر دنیا میں نیک لوگوں میں کبھی شکر رنجی اور جھگڑا پیدا ہی نہ ہوا کرے تو آخرت میں صلح کن لوگوں میں کرائی جائے گی؟ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر مہربان ہو تو حقوق العباد بھی معاف ہوجائیں گے۔ جن کا حق ضائع ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان کے دل میں یہ بات ڈال دے گا کہ وہ زیادتی کرنے والوں کو معاف کردیں جیسے حضرت یوسف کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بھائیوں پر، حضرت یعقوبؑ کو اپنے بیٹوں پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش مکہ پر مہربان کردیا۔ پس جن کا حق ضائع ہوا ان کے نقصان کی تلافی اللہ تعالیٰ کردے گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین نے فتح مکہ کے بعد نومسلم قریش مکہ سے اپنے وہ اموال اور جاگیریں واپس نہیں لیں جو انہوں نے غصب کر رکھی تھیں، بل کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نومسلموں کی بھرپور تالیف قلب فرماتے ہوئے ان کے گھر اموال غنیمت سے بھردیئے۔ پس حقوق العباد کی آڑ میں جیسے برادرانِ یوسف کو کوئی الزام نہیں دیا جاسکتا، معلوم

العاقبہ اور منعم علیہم صحابہ کرامؓ پر بھی کسی طعن کا کوئی جواز نہیں۔

(ھ) سورہ نساء میں ہے کہ جو کوئی کسی مومن کو عمداً قتل کردے اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہے، اسے اللہ نے لعنت کی ہے اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے (۳۶/ج) سورہ نساء کے اس مضمون کو روافض وخوارج صحابہ کرامؓ پر بڑے شدومد سے چسپاں کرنے میں بڑی لذت محسوس کرتے ہیں۔ یہاں یہ امر توجہ طلب ہیں:

۱۔ اگر قتل عمد کی سزا کا یہ مضمون حضرات صحابہ کرامؓ پر (معاذ اللہ) چسپاں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے بارہا (پھر دہرایئے) بارہا مہاجرین وانصار اور مؤلفۃ القلوب کے جنتی ہونے اور مغفور ومرحوم ہونے کی نہایت شدومد سے جو بشارتیں دی ہیں تو کیا یہ سب (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) زیب داستاں کے لئے تھیں اور کیا یہ بشارتیں دیتے وقت (معاذ اللہ) اللہ کو یاد نہیں رہا تھا کہ صحابہ کرامؓ بعد میں قتل عمد میں ملوث ہوں گے؟

۲۔ کہا جاتا ہے کہ قتل عمد کی مذکورہ سزا کے ساتھ توبہ کا ذکر نہیں ہے لہٰذا قاتل کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو نہایت ہی سخت وعید سنائی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں اور انہیں دنیا اور آخرت میں ملعون قرار دیا ہے (۳۷/الف) وہاں بھی توبہ کا قطعاً ذکر نہیں ہے۔ کیا سورہ احزاب کے اس مضمون کو برادرانِ یوسف پر چسپاں کیا جاسکتا ہے؟ اگر نہیں تو سورہ نساء کی قتل عمد والی آیت کو بھی صحابہ کرامؓ پر چسپاں کرنا ہرگز درست نہیں۔ یہ یاد رہے کہ برادران یوسف نے اپنے والد ماجد حضرت یعقوب کو سال ہا سال تک پریشان کئے رکھا اور حضرت یوسف کو کنویں میں پھینک آئے اور پھر جھوٹی کہانی بنا لانے پر اپنے پیغمبر باپ کو نہایت اذیت پہنچائی۔ برادران یوسف کی یہ خبریں قرآن سے ثابت ہیں جن کے سچے ہونے میں ادنیٰ سے ادنیٰ شک کی بھی گنجائش نہیں۔ ادھر صحابہ کرامؓ کے مقام ومرتبہ کو مجروح کرنے والی اکثر وبیشتر روایات کے راوی ابومخنف لوط بن یحییٰ، یحییٰ بن ابی حیہ کلبی، ہشام بن محمد بن السائب کلبی، واقدی وغیرہ وغیرہ ہیں، جنہیں اسماء الرجال کی کتب میں جھوٹے، مفتری اور غالی رافضی وغیرہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر کچھ روایات بالفرض صحیح بھی ہوں تو یہ اخبار آحاد کے درجے میں ہیں جنہیں کتاب اللہ کی محکم آیات کے مقابلے میں ہرگز نہیں لایا جاسکتا۔ انہیں کتاب اللہ کے تابع کرنا ہوگا ورنہ انہیں متروک قرار دینا ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بہ روز قیامت پوچھ لیا، کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا تھا، یوم لایخزی اللہ النبی والذین آمنوا معہ (۳۷/ب) ''قیامت کے دن اللہ اپنے نبی اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا'' صحابہ کرامؓ کے لئے بار بار کی بشارتوں کے ذریعے تمہیں قطعیت

سے معلوم کرا دیا گیا تھا کہ ان کی عاقبت نہایت بہتر ہو گی، اس لئے تمہارے علم میں بھی وہ معلوم العاقبۃ تھے اور خود تمہارا کیا انجام ہوگا، اس کی کوئی قطعی خبر ہم نے تمہیں نہیں دی تھی کہ مومنین کے لئے بشارتوں والی تمام آیات کے اولیں مخاطب تم نہیں بل کہ اصحاب رسول تھے۔ انہیں تو بشارتیں مخصوص کر کے دی گئی تھیں کہ مہاجرین وانصار اور فتح مکہ کے بعد نومسلم قریش مکہ (مؤلفۃ القلوب) سب کے سب مغفور و مرحوم ہیں اور باقی امت کے لئے بشارتیں کسی کے لئے مخصوص نہیں بل کہ عام تھیں۔ ہمیں تو تمہارے انجام کا علم تھا لیکن تم تو اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبۃ تھے۔ کسی بھی مجہول العاقبۃ کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ اپنے انجام سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی بہ زعم خویش کرسی عدالت پر براجمان ہو جائے اور معلوم العاقبۃ لوگوں یعنی میرے رسول کے اصحاب کے متعلق فیصلے صادر کرنے کی جسارت کرنے لگے کہ فلاں یوں تھا اور فلاں یوں تھا؟ اگر تم نے قرآن نہیں پڑھا تھا تو تم سے کس نے یہ کہا تھا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے ایسے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو جو خود تمہارے کہنے کے مطابق تنقید سے بالاتر نہ تھے۔ تم سے کس نے یہ کہا تھا کہ تم ان مورخین اور ان راویوں کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جاؤ؟ خدانخواستہ ایسی باز پرس ہو گئی تو امید نہیں کہ کسی کو تاریخی کتب کے مؤرخین واقدی، طبری، ابن سعد اور غلیظ تاریخی مواد کے راویوں ابو مخنف لوط بن یحییٰ، عطیہ عوفی، ہشام بن محمد بن سائب کلبی وغیرہ وغیرہ کے دامن میں پناہ مل سکے گی۔ جہاں تک کتب حدیث کا تعلق ہے تو اس طرح کی بعض روایات اول تو عموماً احادیث ہی نہیں کیوں کہ حدیث تو قول وفعل رسول کا نام ہے صحابہ وتابعین کے اقوال پر حدیث کا اطلاق محض توسعاً یعنی حدیث کے مفہوم میں وسعت پیدا کرتے ہوئے کر دیا جاتا ہے۔ پھر احادیث اور کتب تاریخ کا خاصا بڑا ذخیرہ اصحاب رسول کی مدح ومنقبت کے مضامین پر بھی تو مشتمل ہے اسے کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟ تاہم ان احادیث اور اسی طرح کی تاریخی روایات کی حیثیت محض تائیدی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے مقام ومرتبہ کو قرآن کریم کی آیات محکمہ اور نصوص قطعیہ نے اس طرح واضح کر دیا ہے کہ ان کے مقام ومرتبہ کو سمجھنا ان تائیدی روایات پر موقوف ہو کر نہیں رہ گیا۔

۳۔ اس بات ہو رہی تھی کہ قتل عمد کی سزا کی آیت میں توبہ کا ذکر نہیں ہے۔ سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ نے احکامِ وراثت بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ یہ حدیں (یعنی وراثت کے احکام) اللہ کی مقرر کی ہوئی ہیں اس کے متصلاً بعد اگلی آیت میں ہے کہ ''جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے آگے نکلے اسے وہ (جہنم کی) آگ میں ڈال دے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا'' (۴/۱۴) دیکھئے یہاں بالخصوص احکام وراثت کو پس پشت

ڈالنے والوں کو بھی قتل عمد کی طرح کی کتنی سخت وعید سنائی گئی ہے اور یہاں بھی توبہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو احکام وراثت پر صحیح معنوں میں عمل کر رہے ہیں؟ ہم بہنوں اور بیٹیوں کو وراثت سے محروم کرنے کے لئے ان بیچاریوں کو عدالتوں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں اور بہن سے کہلواتے ہیں کہ میں اپنے بھائی کے حق میں بیٹھ گئی ہوں حال آں کہ ہم نے اس بیچاری کو کھڑا ہی کب ہونے دیا تھا۔ قتل عمد کی سزا پر زور دینے والے ہمارے بھائی بتائیں کہ انہوں نے احکام وراثت کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے؟ کیا وراثت صحیح نہ تقسیم کرنے والوں کی توبہ کے قبول ہونے کا بھی کسی نے خاص اعلان کیا ہے تو قتل عمد کی سزا کا شور صرف اسی لئے تو نہیں مچایا جا رہا ہے کہ اس کی آڑ میں صحابہ کرامؓ کو ناحق مطعون کیا جا سکے؟

۴۔ سورہ بقرہ میں سود خوروں کو وعید سنائی گئی ہے کہ جو شخص اپنے رب کی نصیحت آجانے کے بعد رک گیا تو (ان آیات کے نزول سے) پہلے جو شخص جو کچھ بھی کر چکا اسے معاف ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ ہاں جو شخص اب دوبارہ یہ (سود خوری کا) کام کرے تو ایسے لوگ جہنم والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۳۸/الف)۔ دیکھئے یہاں بھی سود کی حرمت کی آیتوں کے نزول کے بعد سود خور کے لئے دائمی عذاب کی وعید ہے اور توبہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ کو قتل عمد کی آڑ میں مطعون کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے والے کتنے ایسے لوگ ہیں جو دور حاضر میں بینکوں سے اپنی جمع شدہ رقموں پر سود لے کر اسے ہڑپ نہیں کر رہے؟

۵۔ سورہ نساء میں یہ مضمون دو مرتبہ مذکور ہے کہ اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اس کے علاوہ وہ جس کے لئے چاہے گناہ بخش دے گا (۳۸/ب) توبہ سے اس دنیا میں شرک بھی بالاتفاق معاف ہو جاتا ہے پس یہاں توبہ کے بغیر معافی کا ذکر ہے۔ یعنی بغیر توبہ شرک پر موت ناقابل معافی ہے باقی گناہ جن میں قتل عمد، وراثت صحیح تقسیم نہ کرنا، سود خوری وغیرہ وغیرہ سب شامل ہیں، اللہ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی معاف ہو سکتے ہیں۔ ہاں ایسے شدید گناہوں میں اللہ توبہ کی توفیق سلب کر لے اور بغیر توبہ کے کسی کو معاف نہ کرے تو اس کا بھی قوی خدشہ موجود رہتا ہے۔ وعید پر مشتمل مضامین کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ لوگ اللہ سے ڈریں اور گناہوں پر دلیر نہ ہو جائیں۔ اس سے یہ مفہوم کشید کرنا غلط ہے کہ یہ گناہ ہر حال میں ناقابل معافی ہیں، بل کہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوں گے۔ ناقابل معافی گناہ صرف اور صرف شرک ہے وہ بھی جب کہ توبہ کئے بغیر کوئی شرک پر مر جائے ورنہ دنیا میں توبہ سے شرک بھی معاف ہو جاتا ہے۔

۶۔ اگر کوئی مسلمان خدانخواستہ مرتد ہو جائے بعد میں اسے توبہ کی توفیق نصیب ہو اور وہ دوبارہ

اسلام قبول کرلے تو سب ہی کے نزدیک اس کی توبہ مقبول ہے۔ شرک اور ارتداد تو قتل عمد سے کہیں بڑھ کر گناہ ہے۔ اگر توبہ سے شرک اور ارتداد جیسے گناہ معاف ہو سکتے ہیں تو قتل عمد کو ہر حال میں ناقابل معافی گناہ کیسے سمجھ لیا گیا ہے؟ قرآن کریم میں بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی مغفرت و رحمت کا ذکر فرمایا ہے مثلاً سورہ زُمر میں ہے (اے پیغمبر!) تو (اللہ کی طرف سے لوگوں کو یہ) کہہ دے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ بے شک اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے"۔ (۳۸/ ج) اور مثلاً سورہ طٰہٰ میں ہے کہ "میں بلاشبہ ہر اس شخص کے لئے نہایت بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے پھر سیدھی راہ پر چلتا رہے (۳۹/ الف) سورہ فرقان میں ہے کہ (اللہ کے نیک بندے وہ ہیں) جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسے شخص کو جسے قتل کرنا اللہ نے منع کر دیا ہو وہ بہ جز حق کے قتل نہیں کرتے نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی یہ کام کرے وہ اپنے اوپر سخت وبال لائے گا اسے قیامت کے دن دہرا عذاب دیا جائے گا اور وہ ذلت وخواری کے ساتھ ہمیشہ اسی میں رہے گا، سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور نیک کام کریں ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دیتا ہے اور اللہ نہایت ہی بخشنے والا (اور) نہایت مہربان ہے"۔ (۳۹/ ب) لیجئے یہاں قاتل اور زانی کی توبہ کا بھی ذکر ہے۔ یہاں یہ تاویل درست نہیں کہ اس سے صرف ان کفار کا گناہ معاف ہوگا جو مسلمان ہونے سے پہلے یہ گناہ کرتے رہے ہوں۔ اگر مسلمان کا ارتداد کا گناہ، وراثت صحیح تقسیم نہ کرنے کا گناہ، سود خوری کا گناہ معاف ہو سکتا ہے تو قتل عمد جو ارتداد سے چھوٹے درجے کا گناہ ہے وہ بھی اللہ چاہے تو معاف ہو سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وراثت صحیح تقسیم نہ کرنے، سود کھانے اور قتل عمد پر جو خلود عذاب (عذاب کی ہمیشگی) کی خبر دی گئی ہے اس سے طویل مدت کا عذاب مراد ہے اگر اللہ نے معاف نہ فرمایا ہو اسی لئے خلود کے ساتھ "ابداً" کی قید ان سزاؤں میں نہیں لگائی گئی ہے جب کہ کفار ومشرکین کے عذاب کے خلود (ہمیشگی) کے ساتھ کئی مقامات پر ابداً (دائمی) کا لفظ بھی موجود ہے۔ یہاں یہ تاویل بھی درست نہیں کہ سورہ فرقان کی آیات پہلے نازل ہوئی ہیں اور سورہ نساء کی قتل عمد کی سزا والی آیت بعد میں نازل ہوئی ہے اس لئے یہ پہلی آیتوں کی ناسخ ہے اور سورہ نساء کی متعلقہ آیت کے بعد اسے منسوخ کرنے والی کوئی آیت نازل نہیں ہوگی۔ یہ تاویل اس لئے درست نہیں کہ اَخبار (خبریں) منسوخ نہیں ہوا کرتیں نسخ احکام میں ہوتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی شان کریمی سے بہت بعید ہے کہ وہ پہلے ایک رعایت اور مہربانی سے نوازے بعد میں اسے واپس لے لے۔ نیز یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ سود خوری اور مال وراثت کی صحیح تقسیم پر بھی تو خلود

عذاب کی وعید ہے اور متعلقہ آیات میں توبہ کا بھی ذکر نہیں ہے تو بتایئے ان کے بعد کون سی ایسی آیات نازل ہوئی ہیں جن میں خاص ان ہی گناہوں کی توبہ سے معافی کا ذکر ہو؟ پھر ان آیات کو بھی غیر منسوخ قرار دے کر ان گناہوں کو ہر حال میں نا قابل معافی قرار دینا چاہئے حال آں کہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

۷۔ صحیحین کی احادیث سے ثابت ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے ننانوے قتل کئے تھے۔ اسے کسی مفتی نے فتویٰ دے دیا کہ تیرے گناہ معاف نہیں ہو سکتے اس نے اسے بھی قتل کر کے سو کی تعداد پوری کر دی لیکن اس پر خوفِ خدا غالب آیا اللہ تعالیٰ نے اس کی تو مغفرت فرما دی اور فتویٰ دینے والے بدقسمت عالم کو جہنم کی ہوا اس لئے کھانی پڑی کہ لوگوں کو معاف کرنے اور نہ کرنے کا خدائی منصب اس نے سنبھال رکھا ہے۔ دیکھئے امت محمدیہ تو افضل الامم اور امت مرحومہ ہے اس میں قتل عمد کی سزا کیوں معاف نہیں ہو سکتی؟

۷۔ تاریخی روایات کے مطابق حضرت معاویہؓ نے ابو مسلم خولانیؒ کے ہاتھ سیدنا حضرت علیؓ کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا تھا۔ ابو مسلم حضرت علیؓ کے پاس پہنچے اور رات گزرنے کے بعد اگلے دن انہوں نے علی الصبح یہ منظر دیکھا کہ کوئی دس ہزار سے زائد لوگ پوری طرح مسلح ہو کر بلند آواز سے چلا رہے تھے کہ ہم سب قاتلین عثمانؓ ہیں۔ اگر وہ سچے تھے تو قتل عمد کے معاف نہ ہونے کی آڑ میں حضرت معاویہؓ اور اہل شام کے خلاف طعنہ زنی کرنے والے خوب غور کریں کہ اگر قتل عمد ہر حال میں نا قابل معافی ہے اور قاتل ہر حال میں ہمیشہ جہنمی ہے تو کیا حضرت علیؓ نے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جہنمیوں کی فوج ظفر موج کو اپنے لشکر میں شامل کر رکھا تھا؟ اگر یہ نعرہ زنی کرنے والے جھوٹ بول رہے تھے اور محض اشتعال انگیزی ان کا مقصد تھا تو جو لوگ حضرت علیؓ کے سامنے یوں برملا جھوٹ بولتے ہوں اور اشتعال پیدا کرتے ہوں اگر اس طرح کے لوگ جنگ جمل اور جنگ صفین میں مقتول ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے تو صحابہ کرامؓ کو ناحق مطعون کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟

۹۔ قبل ازیں اپنے مقام پر وہ روایات بھی پیش کی جا چکی ہیں جن کے مطابق سیدنا حضرت علیؓ نے فریقین کے مقتولین پر نماز جنازہ پڑھی۔ آپؓ نے فرمایا کہ فریقین کے وہ مقتول جنت میں جائیں گے جو اللہ کی رضا کے لئے جنگ لڑ رہے تھے۔ بتایئے قتل عمد کی دائمی سزا کدھر گئی؟

۱۰۔ قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ بیعت نہ کرنے کی وجہ سے حضرت علیؓ اہل شام کو باغی تصور فرماتے تھے۔ ادھر چوں کہ حضرت علیؓ کی فوج میں قاتلین عثمانؓ کے ہم نوا بھی خواہی نہ خواہی موجود تھے جنہیں

حضرت معاویہؓ بہ جا طور پر باغی قرار دیتے تھے۔ باغیوں کے خلاف قتال کا حکم تو سورہ حجرات میں موجود ہے تو قتل عمد کی سزا والی آیت کا اطلاق حضرت علیؓ یا امیر معاویہؓ اور ان کے مخلص ساتھیوں پر کیسے ہوگا؟

۱۱۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ دور علوی میں ہزاروں صحابہ کرامؓ موجود تھے لیکن بہ مشکل تیس کے قریب ان جنگوں میں شامل ہوئے تو دونوں طرف کے اصل فتنہ جو لوگوں کو یک سر نظر انداز کر کے معلوم العاقبۃ اور منہم علیہم صحابہ کرامؓ کو ناحق مطعون کرنے کا جواز کیا ہے؟

۱۲۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ چند حضرات قتل عمد کے مرتکب قاتل کی توبہ کے قائل نہیں تھے لیکن جمہور صحابہ کرامؓ اور جمہور اہل علم نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ امت کا اولیں اور افضل ترین طبقہ ہیں لیکن فرداً فرداً معصوم عن الخطا نہیں ہیں اس لئے ان سے علمی مسائل میں اختلاف رائے کی پوری پوری گنجائش موجود ہے لیکن ان کی تنقیص و توہین ہرگز درست نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے سورہ فرقان کی متعلقہ آیات کو منسوخ اور سورہ نساء کی آیت کو جو ناسخ قرار دیا ہے، اس کا جواب مذکورہ بالا سطور میں حسب موقع دیا جا چکا ہے۔ دراصل قاتلین عثمانؓ اور خوارج کی خون ریزی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے تھی اس لئے انہوں نے قتل عمد پر قرآن و حدیث کے تہدیدی مضامین کو پیش نظر رکھا۔ مذکورہ مباحث سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ گو شرک کے سوا کوئی بھی گناہ ناقابل معافی نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ شرک کے بعد قتل ناحق، زنا، سود خوری، مال وراثت کو ورثا میں صحیح تقسیم نہ کرنا اولین کبیرہ گناہوں میں شامل ہیں اور معافی نہ ملنے کی صورت میں ان کی سزا کی مدت بہت طویل ہے۔

(و) سورہ مائدہ میں ہے کہ ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے'' (۳۹/ج) یہ آیت محاربہ کا مضمون ہے اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو محض لوٹ کھسوٹ کے لئے راہ چلتے قافلوں اور افراد اور گروہوں پر حملے کرتے ہوں اور قتل و غارت گری کے درپے ہوں یعنی یہ سزا قطاع الطریق (ڈاکوؤں) کے لئے ہے۔ جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں بل کہ محض سلب ونہب، اغوا اور آبروریزی وغیرہ کے لئے حملے کریں وہ لوگ جو کسی غلط فہمی یا کسی غلط نظریے سے متاثر ہو کر بغاوت کریں وہ اس میں شامل نہیں ہیں جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ سیدنا حضرت علیؓ نے خوارج کے خلاف قتال کیا یہ حقیقی باغی تھے اور یہ سبائیوں کے بطن سے برآمد ہوئے تھے جو قتل عثمانؓ میں ملوث تھے۔ خوارج کو بری طرح شکست ہوئی لیکن حضرت علیؓ نے ان میں سے کسی ایک کو بھی زیر بحث آیت محاربہ والی سزا نہیں

دی۔ خوارج کی گم راہی دینی گم راہی تھی وہ حضرت عثمان، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت علی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم سب کی تکفیر کرتے تھے، جو ان کے ایسے جھوٹے عقائد سے متفق نہ ہوا سے بے دریغ قتل کر ڈالتے تھے۔ اس کے باوجود نہ تو سیدنا حضرت علیؓ نے ان کی تکفیر کی نہ ہی انہیں غلام اور لونڈی بنایا۔ ان کے اموال کو غنیمت کا مال قرار نہیں دیا۔ آیت مُحاربہ والی سزا بھی ان پر نافذ نہیں فرمائی۔ اس لئے اس آیت مُحاربہ کو حضرت معاویہؓ اور اہل شام پر چسپاں کرنا سنگین غلطی ہے اور سیدنا حضرت علیؓ کے اپنے طرز عمل سے ہرگز اس کی تائید وتوثیق نہیں ہوتی۔

(ز) بعض اوقات انسانی افراد کسی ایک یا چند اوصاف کمال میں باہم شریک ہوتے ہیں، گو ان کے مراتب ومدارج یکساں نہ ہوں، مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں وصف نبوت میں شریک ہیں لیکن حضرت موسیٰ کا مقام ومرتبہ حضرت ہارون سے بہت بلند ہے یا مثلاً حضرت علیؓ کا مقام ومرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ سے بہت بلند ہے۔ اس طرح کے حضرات میں بشری تقاضوں کے تحت اگر باہم بھی تلخی اور رنجش ہو جائے اور ان سے ایک دوسرے کے متعلق بہ ظاہر تند وتیز کلمات صادر ہوئے ہوں یا باہم برتاؤ میں وہ سختی اور درشتی سے پیش آئیں تو دوسروں کو خصوصاً جب کہ ان کا زمانہ بھی متاخر ہو، یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ بھی ان کے متعلق اسی طرح کا طرز کلام اور رویہ اختیار کریں یا اسے درست سمجھیں۔ اب مثلاً اگر زید حضرت معاویہؓ کو باغی اور ان کی حکومت کو سلطانِ جور قرار دے تو اسے یہ حق اس لئے حاصل نہیں کہ حضرت معاویہؓ صحابیٔ رسول ہیں اور صحابہ کرامؓ کے متعلق اعلان ہو چکا ہے کہ اللہ قیامت کے دن نبی کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، ان کو رسوا نہیں کرے گا، سورۂ تحریم میں اس مضمون کے متصلاً بعد اگلی آیت میں ہے کہ اے نبی! تو کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کر اور ان پر سختی بھی کر، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانہ ہے (۴۰/ الف) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز ہرگز حضرت معاویہؓ پر سختی نہیں فرمائی بل کہ الٹا انہیں اپنا کاتب وحی مقرر کیا خواہ وحی جلی (قرآن کریم) کی کتابت ہو یا وحی خفی مثلاً خطوط، معاہدات ودستاویزات وغیرہ کی کتابت ہو۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفا کے سیاسی وثیقہ جات مرتب کئے ہیں۔ انہوں نے وثیقہ نمبر ۸۹، ۱۳۱، ۱۶۴، ۱۸۵، ۲۱۵ اور ۲۲۲ میں حضرت معاویہ کا نام بہ طور کاتب بیان کیا ہے۔ امام ابن حزم اندلسیؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین میں سے سب سے زیادہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں رہے۔ دوسرے نمبر پر حضرت معاویہؓ تھے۔ یہ دونوں حضرات دن رات آپ کے ساتھ لگے رہتے تھے اور اس کے سوا کوئی کام نہ کرتے تھے۔ (۴۰/ ب)۔ حضرت معاویہؓ کے والد حضرت ابوسفیانؓ کے گھر کو رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر دارالامان قرار دیا۔ غزوہ حُنین و اوطاس کے بے شمار غنائم سے بہ ظاہر اصل مستحقین انصار مدینہ کو کچھ بھی نہیں دیا اور مہاجرین کو بھی بہت کم دیا اور ان غنیمتوں کا بہت بڑا حصہ نومسلم قریش مکہ وغیرہ مؤلفۃ القلوب کو دیا۔ خود حضرت ابوسفیانؓ کے گھر کو بھی آپ نے مال غنیمت سے بھر دیا۔ پورے خاندان کا آپ نے بے حد اعزاز و اکرام فرمایا۔ اگر یہ حضرات بعد میں (معاذ اللہ) مرتد یا منافق ہونے والے ہوتے تو اللہ تعالیٰ پر الزام آئے گا کہ اس نے منافقین پر سختی کرنے کا حکم تو خاص اپنے نبی کو مخاطب کر کے دے ڈالا لیکن آپ کو یہ بھی نہ بتایا کہ جس خاندان پر آپ اتنی عنایات فرما رہے ہیں یہ خاندان تو (معاذ اللہ) فی الحال منافق ہے یا آپ کے بعد (معاذ اللہ) منافق اور مرتد ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ ادھر زید کو ہرگز قطعی یقین نہیں ہو سکتا کہ اس کی موت ایمان اور اعمال صالحہ پر ہوگی یا وہ ہر حال میں جنت میں جائے گا۔ اگر اسے یقین ہے تو اس کے متعلق وحی تو موجود نہیں۔ یقیناً اس نے اپنی عقل سے فیصلہ کیا ہوگا۔ عقل میں بالاتفاق خطا کا احتمال ہے پس یہی کہنا پڑے گا کہ اللہ ہی کو زید کی عاقبت کا یقینی علم ہے اس لئے زید اپنے علم کے اعتبار سے مجہول العاقبہ ہوا گو شیطان نے اسے معلوم العاقبۃ ہونے کا فریب دے رکھا ہو ادھر بہ شمول حضرت معاویہؓ تمام صحابہ معلوم العاقبہ ہیں جیسے اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ پس جب زید مجہول العاقبہ ہونے کے باوجود معلوم العاقبہ اصحاب رسول کو (معاذ اللہ) باغی یا فاسق قرار دے گا تو یقیناً اپنی حد سے تجاوز کرے گا۔ حد سے تجاوز ہی تو ظلم اور بغاوت ہے پس زید ظالم اور باغی ثابت ہوا۔ اس کے ظلم اور بدظنی کا شکار صحابہ کرامؓ مظلوم ہوئے۔ اگر ان مظلوم صحابہ مثلاً امیر معاویہؓ نے قیامت کے دن ایسے ظالموں کو معاف نہ کیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے خصوصاً جب کہ زید کے دل میں کسی بھی صحابی رسول کے خلاف بغض و نفرت بھی ہو۔ حضرت معاویہؓ کا حلم اور بردباری ضرب المثل ہے۔ ظن غالب ہے کہ وہ ایسی فکری لغزش والوں کو معاف کر دیں گے۔ لیکن جن کے دل میں ان کے خلاف بغض ہے تو ممکن ہے حضرت معاویہؓ یہ کہیں "اے اللہ! اگر حضرت علیؓ نے مجھے باغی کہا تھا تو وہ مقام و مرتبے میں مجھ سے بلند اور وصف صحابیت میں میرے شریک ہیں۔ میرے بھائی حضرت علیؓ کو تو مجھے باغی وغیرہ کہنے کا حاصل ہو سکتا ہے لیکن اپنی حیثیت اور انجام سے بے خبر بعد کے لوگ مجھے باغی قرار دینے والے کون ہوتے ہیں؟ حضرت موسیٰ مقام و مرتبے میں حضرت ہارون سے بلند اور وصف نبوت میں ان کے شریک ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا حضرت ہارونؑ سے سختی سے پیش آنا اور انہیں ان کی ریش مبارک سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا دوسروں کے لئے قطعاً یہ جواز پیدا نہیں کرتا کہ وہ بھی حضرت ہارونؑ سے اسی طرح کا رویہ اختیار کریں اسی طرح دوسروں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بہ زعم خویش حضرت علیؓ کے طریقے پر چلتے

ہوئے مجھے باغی قرار دیں۔ اگر میں واقعی انہیں باغی اور فاسق نظر آ رہا تھا تو اور نہیں، یہ برادران یوسف کے حال پر ہی غور کر لیتے۔ ان کے ظاہری سنگین جرائم اپنے حقیقی باپ اور حقیقی بھائی کے خلاف سرزد ہوئے۔ پھر عام بھائی یا عام باپ کے خلاف نہیں، بل کہ نبی بھائی اور نبی باپ کے خلاف تھے۔ لیکن اے اللہ! جب تو نے انہیں معاف فرما دیا اور ان کی مغفرت کا ذکر قرآن کریم میں یوں فرما دیا کہ ان کے بھائی حضرت یوسف نے انہیں معاف کر دیا اور ان کے والد ماجد حضرت یعقوب نے ان کے لئے استغفار کا وعدہ فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ تو اے اللہ! تو نے کسی کے لئے بھی ان برادران یوسف کے خلاف لب کشائی کی گنجائش نہ چھوڑی۔ کسی کے لئے یہ جواز نہ چھوڑا کہ وہ عدل کی دہائی دے اور اس طرح کے تبصرے کرے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سکھا شاہی نہیں ہے۔ اے اللہ! کسی سے عدل کرنا ہو یا کسی کو معاف کرنا ہو تو ہر گز تو لوگوں سے پوچھ کر ایسا کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اسی طرح اے اللہ! جب تو نے تمام اصحاب رسول کی مغفرت فرما دی اور قرآن کریم میں اس مضمون کو جا بہا مختلف طریقوں سے بیان فرمایا اور یہ بھی اعلان فرما دیا کہ اللہ بہ روز قیامت نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا، تو کسی کو کیا حق تھا کہ وہ تجھے بہ زعم خویش انصاف کا سبق پڑھانے لگے اور میرے خلاف یا کسی بھی صحابی رسول کے خلاف بغض ونفرت رکھتا ہو الب کشائی کرتا پھرے؟ اے اللہ! حقوق العباد میں جن بندوں کا حق ضائع ہوا ہو، تو اگر تو چاہے تو اپنی رحمت کاملہ سے ان کا ضائع کردہ حق ہی پورا نہیں کرتا بل کہ ان کے دل میں حق ضائع کرنیوالوں کے خلاف نفرت کی بہ جائے محبت پیدا فرما دیتا ہے اور انہیں اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ حق ضائع کرنے والوں کو بہ خوشی معاف کر دیں۔ جیسے تو نے اپنے پیغمبر کے دل کو نرم کر دیا اور تیرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر ایسے ہی فراخدلی سے لوگوں کو معاف کر دیا جیسے حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا تھا۔ اے اللہ! جب یہ واضح ہے کہ تیرے رسول کے اصحاب سے بغض ونفرت رکھنے والے اور انہیں باغی اور فاسق قرار دینے والے خود ظالم ہیں تو ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما'' ممکن ہے کہ اس مشکل گھڑی میں زید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی امید رکھے لیکن اسے آپ سے یہ سننا پڑے ''منافقین میرے اصحاب پر غصے سے انگلیاں کاٹتے تھے تو مجھے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے یوں بددعا کرنے کا حکم دیا مُوتو ابغیظکم (۴۰/ج) کہ تم اپنے غصے میں مر جاؤ۔ تو جو میرے اصحاب کا دشمن ہو اس کے خلاف باوجود رحمۃ للعالمین ہونے کے اس بددعا کرنے کا حکم مجھے دیا گیا ہے نہ یہ کہ میں اس کی سفارش کروں اور میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔ جس نے ان سے محبت رکھی تو میری

محبت کی وجہ سے رکھی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو میرے بغض کی وجہ سے رکھا۔ قرآن کریم میں نیک بندوں کی یہ صفت بیان کی گئی تھی کہ وہ سابق الایمان لوگوں کے لئے استغفار کریں تم نے ان کے مطاعن شمار کرنے شروع کر دیئے اور اپنی عاقبت کو فراموش کر دیا۔ صحابہ کرامؓ کے حسن عاقبت کی تو تمہیں بارہا کتاب اللہ میں خبر دی گئی تھی تم خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑے رہے''۔ اللہ تعالیٰ اس مشکل گھڑی سے ہم سب کو بچائے۔ آمین

زید مثلاً یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں اصحاب رسول کو چوں کہ صحبتِ نبوی کی زیادہ مدت حاصل نہیں ہوئی لہٰذا بہ قول زید ان کی پوری قلب ماہیت نہ ہوسکی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود زید کی قلب ماہیت ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر وہ دعویٰ کرے کہ اس کی قلب ماہیت ہو چکی ہے تو زید کے اپنے مفروضے کے مطابق قلب ماہیت کے لئے مثلاً دس سال کی صحبت نبوی کی ضرورت ہو تو جسے پانچ سال کی صحبت حاصل ہوئی اس کی قلب ماہیت پچاس فیصد ہوئی اور جسے دو سال کی صحبت میسر آئی اس کی قلب ماہیت بیس فیصد ہوئی اور جسے زید کی طرح ایک ثانئے (سیکنڈ) کے کروڑیں حصے کی بھی صحبت نبوی میسر نہ ہوئی تو خود زید کے اپنے ہی مفروضے کے تحت اس کی قلبِ ماہیت سرے سے ہی نہیں ہوئی۔ اس صورت میں کون عقل مند صحابہ کرامؓ کے متعلق زید کی کسی بے ہودہ اور لغو رائے کو قبول کرنے پر آمادہ ہوگا؟ زید مثلاً یہ کہتا ہے کہ صحابہ کرامؓ (معاذ اللہ) معیارِ حق نہیں ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خود زید بھی معیارِ حق ہے یا نہیں؟ اگر وہ معیارِ حق ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کا یہ دعویٰ قطعاً قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ جب اس کے بہ قول صحابہ کرامؓ تک معیارِ حق نہیں ہیں تو زید کیسے معیارِ حق بن گیا؟ پس دوسری شق خود بہ خود ثابت ہوگئی کہ زید خود اپنے مفروضے کے مطابق معیارِ حق نہیں ہے۔ حق کا متضاد لفظ باطل اور ضلال ہے قرآن کریم میں ہے **فماذا بعد الحق الا الضلال** (۴۱/الف)۔ ''تو حق کے بعد سوائے گم راہی کے اور ہے ہی کیا؟''۔ جب زید خود اپنے ہی دعوے کی روشنی میں معیارِ حق نہ ہوا تو لازماً معیارِ ضلال ہوا، گو وہ زبان سے اس کا اعتراف نہ کرے۔ کیوں کہ اگر ایک شخص یہ کہے کہ میں صحت مند نہیں ہوں تو دوسری شق یعنی اس کا بیمار ہونا خود بہ خود ثابت ہوگئی۔ جب زید معیارِ ضلال ٹھہرا تو اس کی رائے تو کسی عام شخص کے بارے میں بھی معتبر نہیں ہوسکتی چہ جائے کہ صحابہ کرامؓ کے متعلق اس کی لغو بات کو کوئی وزن دیا جائے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ ہر باطل گو خطا بھی ہے لیکن ہر خطا کو باطل نہیں کہا جاسکتا، ورنہ اجتہادی مسائل میں خطا کرنے والے مجتہد کو بہ موجب احادیثِ صحیحہ اکہرے اور خطا نہ کرنے والے کو دہرے اجر کا مستحق قرار نہ دیا جاتا۔ کیا اہل باطل بھی ترکے کے مستحق ہوا کرتے ہیں؟ پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دیگر افراد کے معصوم عن الخطا نہ ہونے

سے یہ لازم نہیں آتا کہ بہ شمول صحابہ کرامؓ ان میں کوئی بھی معیارِ حق نہیں ہے۔ امت محمدیہ میں بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ ترین اور اولیں معیارِ حق ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحابہ کرام معیارِ حق نہیں رہے۔ بل کہ کتاب اللہ (قرآن کریم) کی نظری رہنمائی کے ساتھ ساتھ رجال اللہ کی عملی رہنمائی بھی لوگوں کو ہمیشہ حاصل رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں جن مُنعم علیہم (انعام یافتہ) لوگوں کے صراط مستقیم پر چلائے رکھنے کی ہمیں دعا سکھائی گئی ہے ان میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے علاوہ صدیقین، شہداء اور صالحین بھی شامل ہیں۔ حال آں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام تو بالاتفاق معصوم عن الخطاء ہیں لیکن مُنعم علیہم کے باقی تینوں گروہ معصوم عن الخطا نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کا راستہ صراط مستقیم ہے۔ پس کوئی زمانہ بھی ایسے رجال اللہ سے خالی نہیں رہتا۔ یہی لوگ معیارِ حق ہیں ورنہ انہیں اہلِ حق اور صراطِ مستقیم پر چلنے والے کیسے کہا جا سکتا ہے؟ یہاں کچھ لوگوں نے افراط سے کام لیتے ہوئے یہ سمجھ لیا کہ دنیا میں ہر زمانے میں کسی زندہ امام معصوم کا وجود ناگزیر ہے تو کچھ لوگوں نے تفریط سے کام لیتے ہوئے ناحق یہ سمجھ لیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی بھی معیارِ حق نہیں۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے معیارِ حق ہونے کے باوجود مراتب اور مدارج باہم متفاوت ہیں یک ساں نہیں، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے بعد دیگر اہلِ حق اور معیارِ حق لوگوں کے مراتب و مدارج کے فرق سے ان کا معیارِ حق ہونا متاثر نہیں ہوتا۔ زید اگر یہ کہے کہ جنگ جمل کے معاملے میں حضرت علیؓ معیارِ حق ہیں یا امیر معاویہ؟ تو ہم زید سے یہ پوچھنے میں حق بہ جانب ہیں کہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے معاملے میں حضرت موسیٰ نے حالتِ غضب میں حضرت ہارون کو سر اور داڑھی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا تو کیا حضرت موسیٰ معیارِ حق تھے یا حضرت ہارون؟ یہاں تحقیقی جواب یہ ہے کہ غیر معصوم کی اگر کوئی غلطی یقینی ذرائع سے یا ظن غالب سے ثابت ہو جائے تو غلطی میں اس کی اتباع نہیں کی جائے گی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ سرے سے معیارِ حق ہی نہیں رہا۔ اسی طرح اگر معصوم عن الخطا یعنی پیغمبر کی کسی خطائے اجتہادی کی اطلاع اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو جائے تو اس میں پیغمبر کی اتباع بھی درست نہ ہوگی مثلاً حضرت نوح کا اپنے کافر بیٹے کے لئے دعا کرنا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی اس کے مخلص بیٹے کی دل جوئی کے لئے نماز جنازہ پڑھانا وغیرہ ایسی مثالیں ہیں جن کی اتباع درست نہیں۔ ان کی ایسی اجتہادی خطاؤں اور ان خطاؤں میں ان کی عدم اتباع سے یہ نتیجہ اخذ کرنا حماقت ہے کہ پیغمبر (معاذ اللہ) سرے سے معیارِ حق ہی نہیں رہا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کو معصوم عن الخطا اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ گناہ کے تو وہ قریب بھی نہیں پھٹکتے بہ تقاضائے بشریت وہ کبھی خطائے اجتہادی کا شکار ہوں تو لازماً انہیں اس کی اطلاع اور خطا کی

اصلاح کردی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر معصوم عن الخطاء کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کو خطا پر باقی اور قائم نہیں رکھا جاتا۔ دیگر افرادِ امت کے لئے خطائے اجتہادی سرے سے قابل مواخذہ ہی نہیں اور اللہ کے نیک بندے گناہ پر اصرار کرتے ہی نہیں بل کہ ایسے غیر معصوم حضرات گناہ کو گناہ سمجھتے اور اس سے توبہ کرتے ہیں تو یہاں بھی وہ توبہ کے لحاظ سے دوسروں کے لئے معیارِ حق ٹھہرتے ہیں۔ بل کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی غیر مسلموں کے لئے اس لحاظ سے معیارِ حق رہے گا کہ اگر وہ بھی اسلام قبول کرلیں تو کم از کم جہنم کے دائمی عذاب سے تو نجات پا ہی جائیں گے۔ الغرض جس طرح پیغمبر کی اجتہادی خطا میں اس کی اتباع جائز نہیں لیکن اس سے اس کا معیارِ حق ہونا متاثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح غیر معصوم کا گناہ ہو یا اس کی خطائے اجتہادی ہو اگر ہمیں اس کا معتبر ذرائع سے علم ہو جائے تو اس گناہ اور خطائے اجتہادی میں اس کی اتباع درست نہیں لیکن اس سے اس کا معیارِ حق ہونا متاثر نہیں ہوگا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ امت کے لئے کامل معیارِ حق پیغمبر ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص معیارِ حق کی اصطلاح کو معصوم عن الخطا کے معنی میں استعمال کرتا ہے تو یہ تعبیر کی غلطی ہے۔ اگر وہ معصوم عن الخطا کی اصطلاح کے لئے معیارِ حق کی اصطلاح کو ہی پسند کرتا ہے تو اس سے پہلے لفظ کامل لگا دینے سے اصطلاح درست ہو جائے گی۔ ورنہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی کسی نہ کسی لحاظ سے معیارِ حق ہے۔ فتدبر وتشکر۔

زید مثلاً یہ کہتا ہے کہ میں نے اور میری طرح کے اور کئی لوگوں نے صحابہؓ کی طرح جرائم نہیں کئے لہٰذا بہ قول زید دورِ حاضر کے لوگ صحابہ کرامؓ سے بہتر ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اگر زید کی جسارت کا یہی عالم رہا تو کل کلاں کو وہ مثلاً یہ دعویٰ بھی کرسکتا ہے کہ ہم نے کبھی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے ہمیں حضرت یونسؑ کی طرح مچھلی کے پیٹ میں جانا پڑا ہو اس لئے ہم سب (معاذ اللہ) حضرت یونسؑ سے بہتر ہیں۔ ہم نے کبھی حضرت موسیٰؑ کی طرح کسی کو ایسا گھونسا رسید نہیں کیا جس سے اس کی جان چلی جائے اور ہم نے کبھی اپنے بڑے بل کہ چھوٹے بھائی کو بھی لوگوں کے سامنے بل کہ خلوت میں بھی یوں شرمندہ نہیں کیا کہ اس کے سر اور داڑھی پر ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچیں، اس لئے ہم (معاذ اللہ) حضرت موسیٰؑ سے بہت بہتر ہیں۔ ہم نے کبھی برادرانِ یوسف والے کام نہیں کئے اس لئے ہم ان سے بہتر ہیں وغیرہ۔ یہ ہمارا محض مفروضہ ہی نہیں، دنیا ایسے احمقوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ انگریز کی مشفقانہ سرپرستی اور نگرانی میں قادیان میں مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تو کچھ چل نکلا۔ دیکھا دیکھی قادیان اور اس کے نواحی علاقوں میں اور بھی کئی لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کر کے قسمت آزمائی کی۔ اسی طرح کا ایک شخص صدیق دین دار تھا جو پہلے مرزا قادیانی کا مرید تھا پھر اس نے یوسف موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ دیں

کہ مسیح موعود کا منصب تو مرزا نے پہلے ہی سنبھال رکھا تھا۔ یہ یوسف موعود اپنے آپ کو حضرت یوسف سے بہتر اور افضل قرار دیتا تھا کیوں کہ بہ قول اس کے ایک نہایت ہی حسین وجمیل دوشیزہ نے آدھی رات کے وقت اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی لیکن وہ اس کے دام محبت کا اسیر نہ ہو سکا، وہ اس سلسلے میں حضرت یوسف سے اپنا تقابل یوں کرتا ہے:

''زلیخا بوڑھی، یہاں جوان، یوسف غلام، یہاں آزاد۔ عزیز مصر کا خوف، یہاں کوئی خوف نہیں۔ زلیخا بہ جائے والدہ پرورش کے تھی۔ یہاں مقابلے کی زندگی۔ زلیخا منکوحہ، یہاں غیر کی منسوبہ درحقیقت اپنے نام کی۔ وہاں دن کا وقت، یہاں رات کا وقت۔

اس واقعے کے بعد پھر میرے دل میں نفس کے جذبات بالکل ٹھنڈے ہو گئے.....'' (۴۱/ب)

تحقیقی جواب یہ ہے کہ مہاجرین مکہ کے متعلق سورہ توبہ میں ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور (پھر) انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک سب سے اونچے درجے والے ہیں اور یہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔ انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور رضامندی کی اور جنتوں کی خوش خبری دیتا ہے۔ ان (جنتوں) میں ان کے لئے ہمیشہ باقی رہنے والی نعمت ہے۔ وہ ان (جنتوں) میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ بے شک اللہ کے پاس (ان لوگوں کے لئے) بہت بڑا اجر ہے (۴۱/ ج) غزوہ حدیبیہ میں شریک اصحاب رسول کے متعلق سورہ فتح میں ارشاد ہے کہ اللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور اللہ نے انہیں پرہیزگاری کے کلمے پر جمائے رکھا اور وہ اس کے سب سے زیادہ مستحق اور سب سے زیادہ اہل ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (۴۲/ الف) سورہ بنی اسرائیل میں ہے کہ رحمٰن کی شان کسی باخبر سے پوچھ (۴۲/ ب) صحابہ کرامؓ نے رحمٰن کی شان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی تھی اور آپ سے بڑا باخبر کون ہو سکتا ہے؟ سورہ تحریم میں ہے یوم لا یخزی اللہ النبی والذین اٰمنوا معہ (۴۲/ ج) یعنی بہ روز قیامت اللہ نبی کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو رسوا نہیں کرے گا۔'' یہاں آیت میں کلمہ معہ نے باقی امت کو صحابہ کرامؓ سے الگ کر دیا ہے۔ اگر پوری امت مراد ہوتی تو معہ کی قید کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ بے مقصد کلام عیب ہوتا ہے اور اللہ کا کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ صحابہ کرامؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ایمانی معیت ہی نہیں بل کہ زمنی ومکنی یعنی زمان ومکان کے اعتبار سے بھی معیت حاصل ہے۔ آیت کے اولیں مخاطب صحابہ کرامؓ ہیں۔ باقی امت کے وہ افراد بھی شامل ہیں جو ان صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چلیں، ان کا احترام کریں نہ کہ دل میں ان سے بغض رکھیں اور اپنے آپ کو ان سے افضل سمجھنے کے فریب نفس میں مبتلا ہوں۔

سورہ اعراف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنی خاص الخاص رحمت کے حوالے سے یہ بتایا تھا کہ اس کے مستحق وہ لوگ ہیں جو محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے اور ان کی حمایت اور مدد کریں گے (۴۳/ الف)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی حمایت ونصرت آپ کی دنیوی حیاۃ طیبہ میں صحابہ کرامؓ ہی نے کی۔ باقی امت تو بالواسطہ مخاطب ہے۔ سورہ نجم میں ہے کہ وہ (اللہ) تمہیں بہ خوبی جانتا ہے جب کہ اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں تھے۔ پس تم اپنی پاکیزگی آپ بیان نہ کرو۔ وہی پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے (۴۳/ ب)۔ صحابہ کرامؓ کی بار بار مدح اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود فرمائی ہے۔ دوسرے لوگ اپنی مدح خود کریں اور اس میں وہ اپنے آپ کو صحابہ کرامؓ سے بھی افضل سمجھنے لگیں تو انہیں سورہ نجم کے مذکورہ مضمون پر خوب غور کرنا چاہئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صحابہ کرامؓ ہمارے لئے معلوم العاقبہ اور ہم اپنے علم کے لحاظ سے مجہول العاقبہ ہیں۔ مجہول العاقبہ لوگ اپنے آپ کو معلوم العاقبہ سے افضل سمجھنے لگیں تو ایسے لوگوں کو صدیق دیندار کی طرح جاہل اور احمق ہی قرار دیا جاسکتا ہے جس کا ذکر ہم گزشتہ سطور میں کر چکے ہیں۔

گندم سے گندم اور جَو سے جَو اگنے کی کہاوتیں صحابہ کرام پر چسپاں کرنا بھی فریب نفس ہے۔ یہ قوانین فطرت گو بہ طور عادت لگے بندھے نظر آتے ہیں لیکن یہ سمجھ لینا قطعاً غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو بھی ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ دشمنوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا تو آگ جو بہ ظاہر ہمیشہ جلاتی ہے، حضرت ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی (۴۳/ ج)۔ پس گندم سے گندم اور جَو سے جَو والی مثالیں مُنعم علیہم اور معلوم العاقبہ صحابہ کرامؓ پر چسپاں نہیں ہوتیں۔ ورنہ زید کے فلسفے کی رو سے برادران یوسفؑ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ اس طرح کی مثالیں تب کچھ درست سمجھی جاسکتی تھیں جب کوئی یہ دعویٰ کرتا کہ انسان سے انسان نہیں بل کہ گھوڑے اور خچر وغیرہ پیدا ہوا کرتے ہیں۔ ایسی کہاوتوں اور مثالوں کا ایمان اور اعمال صالحہ یا کفر اور اعمال سیئہ پر چسپاں کرنا درست نہیں ورنہ اس فلسفے کی رو سے کافر وفاسق کے نطفے سے ہمیشہ کافر وفاسق اور صالح ومومن کے نطفے سے ہمیشہ صالح مومن ہی پیدا ہونا چاہئے، حال آں کہ ایسا ہونا ہرگز ضروری نہیں۔ ابوجہل اس امت کا فرعون ہے تو اس کا بیٹا عکرمہ صحابیٔ رسول ﷺ ہے۔ حضرت نوح اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں تو ان کا ایک بیٹا کافر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مثلاً سورہ فتح میں نہایت ہی شاہانہ انداز میں کیا خوب فرمایا ہے کہ اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی حکومت ہے وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت ہی مہربان ہے (۴۴/ الف) اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بے پایاں مغفرت اور رحمت کسی زید کو

پسند آئے یا نہ آئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سب ہی اصحاب رسول کے متعلق صاف صاف اعلان فرمادیا ہے کہ وہ بہ روز قیامت اپنے نبی ﷺ اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا تو اس پر کسی زید کا واویلا اور احتجاج حقائق کو نہیں بدل سکتا۔ یہ کہنا کہ بُرے کو برا سمجھنا چاہئے ورنہ ہلاکو اور چنگیز خاں کی تعریف کیوں نہیں کی جاتی، اس طرح کی مثالوں سے حضرات صحابہ کرامؓ کو مطعون نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہلاکو اور اس کے ساتھیوں کی اسی طرح قاتلینِ عثمانؓ، سبائیوں، خوارج اور قاتلین حسینؓ وغیرہ کی قرآن کریم میں واشگاف الفاظ میں بار بار مدح فرمائی ہوتی ان کے لئے اپنے مشفق اور مہربان ہونے کا بار بار حوالہ دیا ہوتا تو یقیناً کسی کو ہلاکو وغیرہ کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالنا زیب نہ دیتا اور اگر اللہ تعالیٰ نے مثلاً برادران یوسف کا مغفور و مرحوم ہونا بیان نہ فرمایا ہوتا تو ہم عقل ومشاہدے اور لوگوں کی خبروں کے مطابق ان کو بھی ہلاکو اور چنگیز خاں سے (معاذ اللہ) تشبیہ دیتے۔ اللہ کی خبر کے مقابلے میں معلومات کے باقی ذرائع غیر معتبر ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے کسی کی حسنِ عاقبت کی قطعی الدلالہ خبر دے دی ہو لیکن دنیا بھر کی زبانیں اور کتابیں اسے بُرا اور ظالم کہتی ہوں تو اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان رکھنے والا صرف اللہ تعالیٰ کی بات کو ہی مانے گا۔ اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے وہ اسے کسی بھی تحقیق وتدقیق کی ضرورت محسوس کئے بغیر فوراً جھٹلا دے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو جنت ومغفرت کی بشارت دی ہو وہ کتنے ہی گھناؤنے جرائم کرتا نظر آئے، اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والا شخص اس شخص کی بہر حال حمایت ہی کرے گا اور اس کے حسنِ عاقبت پر یقین رکھے گا۔ اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کسی فرد یا جماعت کے گم راہ ہونے کی خبر دی ہو جیسے خوارج کی گم راہی کی خبر دی وہ کیسا ہی پرہیز گار کیوں نہ نظر آئے، اسے گم راہ ہی سمجھا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر عقل ومشاہدہ اور تاریخی خبروں کو تب ہی معتبر سمجھا جاسکتا ہے اگر وہ کتاب اللہ کے خلاف نہ ہوں۔ ہم نے ان مباحث میں جو کتب تاریخ وغیرہ کے حوالے دیئے ہیں تو صرف یہ بتانے کے لئے دیے ہیں کہ حسنِ اتفاق سے ان میں ایسا بے شمار مواد بھی شامل ہے جو کتاب اللہ کے یا اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اگر ایسے مواد کو جمع کیا جائے تو ضخیم کتب تیار کی جاسکتی ہیں مثلاً مولانا محمد نافع کی کتاب رحماء بینھم اسی طرح کی ایک بے مثال کتاب ہے۔ جہاں تک کتب تاریخ وغیرہ میں صحابہ کرام کے خلاف غلیظ مواد کا تعلق ہے تو ہم اسے کتاب اللہ سے معارض اور مخالف جانتے ہوئے فوراً جھٹلاتے ہیں۔ غلاظت پسند لکھی کی طرح اس پر گر کر کسی کو بھی اپنی عاقبت خراب نہیں کرنی چاہئے بعض کتب یا ان کے بعض یا اکثر مضامین کو صحابہ کرامؓ اور بزرگوں کی طرف غلط منسوب کیا گیا ہے اول تو ان کی روایات بے سند ہوتی ہیں اگر سلسلہ سند موجود بھی ہو تو راوی جھوٹے، مجہول الحال یا کم از کم ضعیف اور غیر معتبر ضرور

ہوتے ہیں مثلاً تفسیر ابن عباسؓ کے نام سے جو تفسیر آج ملتی ہے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں کیوں کہ یہ کتاب محمد بن مروان السدی عن محمد بن السائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ کی سند سے مروی ہے۔ محدثین نے اسے سلسلۃ الکذب (جھوٹ کا سلسلہ) قرار دیا ہے۔ (۴۴/ب) اور مثلاً نہج البلاغہ حضرت علیؓ کی طرف بلا سند منسوب ہے۔ اس کے کچھ خطبات درست اور کچھ مشکوک تو کچھ یقیناً غلط ہیں۔ قیامت کے دن یہ سوال تو ہوگا کہ قرآن پر ایمان تھا یا نہیں۔ یہ ہرگز نہیں پوچھا جائے کہ مثلاً تم تاریخ طبری، تاریخ ابن خلدون، نہج البلاغہ وغیرہ وغیرہ پر کیوں ایمان نہیں لائے تھے؟ ان کتب کا قابل قبول مواد مفید ہوسکتا ہے اور اتمام حجت کے لئے ان کے حوالے بھی دیئے جاسکتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ کتاب اللہ کے مقابلے میں جھوٹی روایات کا بحر ذخار بھی ہیکار ہے۔ قرآن کریم میں ۔۔۔ کے متعلق ایک چھوٹی سی خبر یہ دی گئی وما قتلوہ وما صلبوہ (۴۴/ج) اور ان لوگوں نے اسے (عیسیٰ) کو نہ قتل کیا ہے اور نہ ہی سولی دی ہے۔'' اب دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جیسی معتبر سمجھی جانے والی حوالے کی سینکڑوں کتب میں اور کروڑوں عیسائیوں اور اسی طرح یہودیوں کی زبانوں پر یہ دروغ بے فروغ چل رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہوئے تھے، تو کتاب اللہ کے مذکورہ چند کلمات کے مقابلے میں ان کی پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں ہے۔ پس کتب تاریخ وغیرہ میں صحابہ کرامؓ کے متعلق جو باتیں جھوٹی ہیں وہ تو سرے سے توجہ کے لائق ہی نہیں اور ان کے خلاف جو باتیں بالفرض صحیح ہیں تو قرآن کریم کی محکمات قاطعہ اور نصوص واضحہ کی روشنی میں ہمارا پختہ ایمان ہے کہ صحابہ کرامؓ کی عاقبت بہر حال نیک ہے جیسے برادرانِ یوسف پر بدگمانی ممنوع ہے ویسے ہی صحابہ کرامؓ کے متعلق حسن ظن واجب ہے۔ فرداً فرداً ان مطاعن کو زیر بحث لانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اس نے مثلاً حضرت نوحؑ سے کہہ دیا کہ بیٹے کے متعلق مجھ سے آئندہ کوئی دعا نہ کرنا، ایسی کسی بات کا مجھ سے سوال نہ کرنا جس کا تجھے علم نہیں۔ انی اعظك ان تكون من الجاهلين (۴۵/الف) اور میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے مت ہو۔'' اللہ بڑا ہے مخلوق اس کے سامنے عاجز ہے وہ جو چاہے اور جسے چاہے کہے لیکن اگر کوئی اور حضرت نوحؑ کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جاہل اور نادان کہے گا تو اپنی عاقبت برباد کر بیٹھے گا۔ سیدنا حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ جیسے اصحاب رسول سے مقام بہت بہت بلند ہے وہ سخت لہجے میں مثلاً حضرت معاویہؓ کو باغی کہیں یا اپنے سے کم تر کسی صحابی رسول کے لئے کوئی تند و تیز لہجہ اختیار فرمائیں یا سخت رویہ اپنائیں تو بعد کے لوگوں کو ایسا کرنے کا حق نہیں ہے ورنہ ایسا کرنے والا اپنا ہی نقصان کرے گا۔ معلوم العاقبہ اصحاب رسول پر مجہول العاقبہ لوگوں کا نامناسب تبصرہ عقلاً ونقلاً کیسے پسندیدہ ہوسکتا ہے؟

سترہواں شبہ: یہ ہوسکتا ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ واقعی مُنعم علیہم ہیں تو قرآن کریم میں بعض اوقات ان کے متعلق سخت کلمات کیوں لائے گئے ہیں؟ اس شبہے کا جواب بھی سورہ فاتحہ میں یوں موجود ہے کہ منعم علیہم لوگ وہ ہیں جو صراط مستقیم پر چل رہے ہیں۔ اس راستے پر چلنے میں اگر بشری تقاضوں کے تحت کوئی کوتاہی سرزد ہو۔ تو اللہ تعالیٰ جو نہایت ہی مہربان مُعلم ومربی ہے اپنے مقرب بندوں کے لئے سخت کلمات لانے کے باوجود ایسا انداز اختیار فرماتا ہے کہ ان مقربین کا مقام ومرتبہ ہرگز مجروح نہ ہو، ان کی عظمت وسطوت نہ صرف بہ حال رہے، بل کہ اس میں کچھ مزید اضافہ ہی ہو۔ اصلاح وتربیت کے سلسلے میں قرآن کریم میں جو حکیمانہ انداز اختیار کیا گیا ہے، اس کی وضاحت ہم نے بائبل اور قرآن کے تقابلی مطالعے کے مضامین میں ''ایمان واسلام'' کے ایک ذیلی عنوان اخلاقی تزکیہ کے تحت بخوبی کردی ہے۔ (۴۵/ب)۔ اصلاح وتربیت کا بسا اوقات تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سخت کلمات استعمال کئے جائیں۔ صحابہ کرامؓ تو ایک طرف رہے، اللہ تعالیٰ نے تو حضرات انبیاعلیہم السلام کے لئے بھی سخت کلمات کا استعمال کیا ہے کیوں کہ اللہ بڑا ہے اور حضرات انبیاعلیہم السلام اس کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔ مثلاً حضرت آدم اور حضرت حوّا جنت میں شجر ممنوعہ کے پاس اجتہادی غلطی سے چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے سخت الفاظ میں فرمایا کہ شیطان نے ان دونوں کو اس جگہ سے پھسلایا اور انہیں اس جگہ (جنت) سے نکلوادیا جس میں وہ دونوں تھے (۴۵/ج)۔ حضرت نوحؑ نے اپنے کافر یا منافق بیٹے کے لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی تو یہ بھی فرمایا کہ (اے نوح!) میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ ہو (۴۶/الف)۔ دوسروں کی اصلاح کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ اگر یہ (رسول) ہم پر کوئی باتیں ازخود بنالاتا تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر ہم اس کی شہ رگ کاٹ دیتے پھر تم میں سے کوئی بھی مجھے اس سے روکنے والا نہ ہوتا (۴۶/ب) سورہ یونس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تجھے اس کتاب کے متعلق شک ہے جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے تو پھر تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو تجھ سے پہلے کتاب (تورات) پڑھتے ہیں (یعنی انصاف پسند اہل کتاب سے پوچھ لے)۔ بے شک تیرے پاس حق آپہنچا ہے پس تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو (۴۶/ج) نیز اسی سورت میں ہے کہ (اے پیغمبر!) کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن ہوجائیں (۴۷/الف)۔ سورہ تحریم میں ہے کہ اے نبی! تو اس چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لئے حلال کی ہے (کیا) تو اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے؟ (۴۷/ب) سورہ احزاب میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو لوگوں سے ڈرتا تھا، حال آں کہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تو

اس سے ڈرے (۴۷/ ج) اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا مقام عبدیت بہت بلند ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور اپنی معمولی سے معمولی بھول اور خطا کو بھی بہت بڑی غلطی سمجھتے ہیں مثلاً حضرت آدمؑ سے شجر ممنوعہ کے پاس جانے کی اجتہادی خطا ہوئی تو حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ نے یوں استغفار کیا کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ (۴۸/ الف)۔ حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ کو یوں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہر عیب سے پاک ہے بے شک میں ہی ظالموں (اپنے حق میں زیادتی کرنے والوں) میں سے ہوں۔ (۴۸/ ب) اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کی ان ادعیہ اور اذکار کی اور ان کے منکسرانہ مزاج اور گفتگو کی حیثیت (معاذ اللہ) مدعا علیہ کے اس اقبالی بیان کی نہیں جس سے کسی مدعی کا حق ثابت ہوتا ہو اور یہ کہا جائے کہ کسی بھی اعتراف جرم کرنے والا کا اقرار واعتراف معتبر ہوگا جب کہ وہ عاقل و بالغ ہو اور ہوش وحواس کی حالت میں اقرار جرم کرتا ہو۔ دیکھئے اب اگر کوئی ملحد مذکورہ طرز کے قرآنی مضامین سے اس طرح کے بے ہودہ اور جھوٹے نتائج اخذ کرے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت یونسؑ (معاذ اللہ) معصوم عن الخطا نہ تھے کیوں کہ وہ خود اپنے ظالم ہونے کا اقرار کر رہے ہیں، یا حضرت آدمؑ (معاذ اللہ) شیطان کے بہکاوے میں آجایا کرتے تھے، یا حضرت نوحؑ (معاذ اللہ) نادانوں میں شامل ہو گئے تھے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کی طرف (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کوئی جھوٹی باتیں منسوب کرنے کا ارادہ تھا یا آپ کو (معاذ اللہ) قرآن کریم پر کوئی شک ہو چلا تھا جسے رفع کرانے کے لئے آپ کو اہل کتاب سے پوچھنے کا حکم دیا گیا یا آپ لوگوں کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) زبردستی دین اسلام میں داخل کرنا چاہتے تھے یا (معاذ اللہ) آپ اللہ تعالیٰ کے حلال کو حرام ٹھہراتے تھے۔ یا آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں (معاذ اللہ) اپنی بیویوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے یا آپ (معاذ اللہ) اللہ سے ڈرنے کی بجائے لوگوں سے زیادہ ڈرتے تھے وغیرہ من الخرافات۔ اس طرح کے نتائج اخذ کرنے والا یقیناً جھوٹا اور گمراہ ہے۔ جب ایسے مُلحد سے کہا جائے کہ تم اس طرح حضرات انبیا علیہم السلام کی سخت توہین کر رہے ہو اور سخت ترین تعزیر وعقوبت کے مستحق ہو تو وہ کچھ اس طرح کا جواب دے ''بتائیے پھر مذکورہ قرآنی آیات کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں؟ اگر کوئی ثابت کرے کہ قرآنی آیات کے میں نے غلط حوالے دیئے ہیں، کوئی خیانت کی ہے یا قرآنی آیات میں کوئی کمی بیشی کی ہے تو میں اسے منہ مانگا انعام دینے کو تیار ہوں۔ بتائیے ان قرآنی آیات کی تلاوت کرنے والے، ان کا ترجمہ کرنے والے، ان کی تفسیر لکھنے اور بیان کرنے والے، انہیں مدارس میں پڑھنے اور پڑھانے والے

بھی توہین رسالت کے مرتکب ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر میں سزا کا مستحق ہوں تو یہ کیوں نہیں؟ اچھا بتایئے یہ توہین رسالت کیا ہوتی ہے؟ توہین کسے کہتے ہیں اور رسالت کیا ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ'' ایسے ملحد کا اس طرح کا طنزیہ اور استہزائیہ کلام اسے بری الذمہ قرار نہیں دے گا بل کہ اس کے جرم کو کئی گنا زیادہ پختہ اور سنگین کردے گا۔ بعینہٖ یہی حکم ایسے شخص کا بھی ہوگا جو صحابہ کرامؓ کے متعلق اصلاح وتربیت کے سلسلے کی آیات سے مذکورہ طرز کے نتائج اخذ کر کے کج بحثی کرے، بل کہ طنزیہ اور استہزائیہ انداز میں اپنے مکروہ عمل پر اصرار بھی کرے۔ تعزیرات میں حسب موقع وضرورت حاکم مجاز کو کمی بیشی کا اختیار حاصل ہوتا ہے اگر ایسے ملحد کے لئے کوئی سخت سزا تجویز کی جائے تو اسے یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ زمانہ ماضی اور قرون وسطیٰ میں تو ایسی سزائیں نہیں دی جاتی تھیں۔ اب یہ سزا کیوں دی جارہی ہے؟ یہاں اصل حقیقت یہ ہے کہ چھوٹوں کی تربیت کے لئے بڑے لوگ عام لسانی محاورات کے مطابق تغلیظاً (سختی کرتے ہوئے) ایسے الفاظ وکلمات استعمال کرتے ہیں جن کا مدلول حقیقی نہیں ہوتا بل کہ حقیقت مہجور یعنی متروک ہوتی ہے جیسے کوئی استاد کسی شاگرد کی اصلاح کے لئے اُسے نالائق کہہ دے تو بسا اوقات حقیقی معنی مقصود نہیں ہوتا، بل کہ صرف اصلاح وتربیت مقصود ومطلوب ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا طرز بھی لسانی محاورات کے مطابق ہے تاکہ اسے سمجھنے میں آسانی ہو۔ مثلاً غزوہ احد میں جن لوگوں نے درّہ چھوڑ دیا تھا اور مال غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے انہوں نے یہ غلط خیال قائم کرلیا تھا کہ جنگ ختم ہوچکی ہے اور دشمن پسپا ہوگیا ہے۔ مال غنیمت وہ صرف اپنے لئے ہی نہیں سب مسلمانوں کے لئے جمع کر رہے تھے۔ جن تیراندازوں نے درّہ نہیں چھوڑا تھا ان کے ساتھ درّہ چھوڑنے والوں کا تقابل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی دنیا چاہتا تھا اور کوئی آخرت کا ارادہ رکھتا تھا (۴۸/ ج) ان درّہ چھوڑنے والوں کی اصلاح اور تادیب مقصود تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ (معاذ اللہ) منافق تھے یا دنیا طلبی کے لئے مسلمان ہوئے تھے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان کی معافی کا دو مرتبہ اعلان کیوں کرتا؟ (۴۹/ الف) اپنے رسول کو کیوں حکم دیتا کہ انہیں معاف کردو اور ان کے لئے استغفار کرو اور اہم معاملات میں انہیں شریک مشورہ کیا کرو، وہ ان کے لئے اپنے رسول کے دل کو کیوں نرم کرتا اور وہ اس امر کا کیوں اہتمام کرتا کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد ہی رہیں؟ (۴۹/ ب) حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی نبی ﷺ کے ساتھ تھے، میرے علاوہ بلالؓ، ابن مسعودؓ، ایک ہذلی اور دو مزید صحابی تھے۔ اشراف واعیان قریش نے خواہش ظاہر کی کہ اگر آپ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹادیں تو ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کی بات سن لیں گے۔ نبی ﷺ کو خیال گزرا کہ ایسا کرنے سے شاید یہ لوگ راہ راست پر آجائیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

(اے پیغمبر!) تو اپنے آپ کو ان ہی کے ساتھ رکھا کر جو اپنے رب کو صبح وشام پکارتے ہیں اور اس کی رضا چاہتے ہیں۔ خبردار! تیری نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں کہ تو دنیوی زندگی کی ٹھاٹھ کے ارادے میں لگ جائے۔ اور تو اس کا کہنا نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا یہاں آیت کے متعلقہ کلمات تُرید زینة الحیوٰة الدنیا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ واقعی دنیوی ٹھاٹھ باٹھ کا کوئی ارادہ دل میں لئے ہوئے تھے بل کہ صرف اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ متکبر اعیان قریش جو غریب ومسکین صحابہ کرامؓ کو حقیر سمجھتے ہیں وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ آپ ان مغرور مشرکین کی خاطر ان اصحاب کو اپنی مجلس سے اٹھائیں۔ اسی طرح غزوہ احد کے موقع پر درّہ چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے والوں کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ تم میں کسی کا ارادہ آخرت کا اور کسی کا دنیا کا تھا، اس سے ان کی اصلاح مقصود ہے نہ یہ کہ وہ (معاذ اللہ) طلبِ دنیا کے لئے مسلمان ہوئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے متعلق بعض مزید اہم مباحث کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات حجۃ الوداع کے سلسلے میں ہمارے متعلقہ حواشی کا مطالعہ کیجئے۔ (۵۰/ الف)

سورہ فاتحہ میں عقیدہ توحید کا اثبات اور شرک فی الذات والصفات کا ابطال عقلی دلائل سے کیا گیا ہے اور ان ہی دلائل کے ضمن میں عقیدہ آخرت کو بھی ثابت کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہم سے کہلوایا گیا ہے کہ اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور مافوق الاسباب یعنی غیر اختیاری امور یا امور غیر عادیہ میں صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے صرف دنیوی نعمتیں ہی مطلوب نہیں بل کہ سب سے بڑی نعمت صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ ہماری اولیں طلب ہونی چاہئے جس پر چل کر ہم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ کر منزل مقصود یعنی جنت تک پہنچ جائیں کیوں کہ دنیوی زندگی اور اس کی رونق عارضی وفانی اور اُخروی عذاب باقی ودائمی ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ ''جو شخص (جہنم کی) آگ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کام یاب ہوگیا'' (۵۰/ ب) صراطِ مستقیم صرف عقل سے معلوم نہیں ہوسکتا ورنہ دنیا میں متضاد عقائد اور نظریات کے حامل مختلف مذاہب موجود نہ ہوتے۔ اس لئے ہمیں سکھایا گیا ہے کہ تم مُنعم علیہم (انعام یافتہ) لوگوں کے راستے پر چلنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ پس عقلی دلائل کے بعد سمعی ونقلی دلائل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ صراط مستقیم میں عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی شریعت مطہرہ کی صورت میں مل گئی۔ مُنعم علیہم لوگوں میں امم سابقہ کے انبیا علیہم السلام اور ان کے سچے متبعین بھی داخل ہیں۔ اسی طرح مغضوب علیہم (اللہ کے غضب میں مبتلا) اور گم راہوں میں امم سابقہ کی معذب قومیں، اللہ اور اس کے پیغمبروں سے بغاوت کرنے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ یوں سورہ فاتحہ میں کلمات انعمت علیهم، المغضوب علیهم، الضالین قرآن کریم

میں مذکور امم سابقہ کے واقعات وحالات (قصص القرآن) کا خلاصہ ہیں۔ قرآنی امثال عقائدِ صحیحہ کے اثبات اور عقائد باطلہ کے ابطال کے لئے ہی لائی گئی ہیں۔ اس لئے سورہ فاتحہ تمام قرآنی عقائد، احکام، قصص اور امثال کا نچوڑ ہے۔ اسے ام القرآن کہا جاتا ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں اسے بہ طور تلاوت و دعا دونوں حیثیتوں سے پڑھا جاتا ہے اور سورت کے اختتام پر آمین (اے اللہ! اس دعا کو قبول فرما) کہا جاتا ہے۔ سورہ فاتحہ میں یہ دعا کہ اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلا، تب ہی قبول ہوسکتی ہے جب دعا مانگنے والے کو علم ہو کہ امت محمدیہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد منعم علیہم لوگوں کا اولیں طبقہ کون ہے جس نے قرآن کریم اور اسوۂ رسول کو آئندہ نسلوں تک منتقل کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بہ ذات خود اپنے دستِ مبارک سے بسم اللہ بھی کسی کو لکھ کر نہیں دی اور نہ ہی آپ نے اپنی حیات طیبہ میں قرآن کریم کو کاغذ پر لکھوا کر یک جا کروایا۔ یہ متعدد ٹکڑوں پر صحابہ کرامؓ ہی سے آپ نے لکھوایا اور دنیا سے آپ کی رحلت کے بعد صحابہ کرامؓ ہی نے اسے یک جا کر کے امت تک منتقل کیا۔ یہی طبقہ اس امت کا اولین انعام یافتہ طبقہ ہے۔ اس حقیقت کو سمجھے بغیر اور اس کا اعتراف کئے بغیر لاکھ مرتبہ بھی سورہ فاتحہ کا ورد کیا جائے تو بھی دعا قبول نہیں ہوسکتی کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کا راستہ ہی تو صراط مستقیم ہے اور یہی امت کے بعد کے طبقات کے لئے بھی مقصود ومطلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے ایجازی پہلو کو زیر بحث لاتے ہوئے ہم نے خاصی تفصیل سے یہ واضح کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ اس امت کا اولیں انعام یافتہ طبقہ ہیں اور یہ کہ اس سلسلے کے تمام شبہات کا جواب سورہ فاتحہ میں اجمالاً اور پورے قرآن میں تفصیلاً موجود ہے۔ آیئے ہم پھر سورہ فاتحہ کے ایجازی پہلو پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے اس کے مضامین کا تقابل بائبل کے متعلقہ مضامین سے کریں۔

حضرات انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا لبِ لباب عقیدہ توحید ہے۔ اگر خدا ایک سے زائد فرض کر لئے جائیں تو جتنی بھی مغز کھپائی کی جائے انسانی عقل لازماً اس نتیجے پر پہنچے گی کہ یہ خدا سب کے سب یا ایک کے سوا باقی سب عیوب ونقائص اور مخلوق والی کم زوریوں سے پاک اور منزہ نہیں ہیں، جیسا کہ ہم ابتدا میں دلائل توحید پیش کر چکے ہیں۔ قرآن کریم نے اس توحید ذات کو دو کلموں الحمدللہ میں سمو دیا کہ عقلاً اللہ تعالیٰ کو ہر عیب سے پاک اور ہر کمال کا مالک ہونا چاہئے، چناں چہ جو سب کمالات کا مالک اور تمام نقائص سے پاک ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہ یکتا ہے۔ اس کے بعد توحید ربوبیت سے دہریت اور شرک فی الصفات دونوں کی جڑ رب العالمین کے کلمات سے کاٹ کر رکھ دی۔ کائنات کی بے پایاں وسعت کو جس کے تصور سے ہی سر چکرانے لگتا ہے، کلمہ العالمین میں سمو دیا کہ تم اس کائنات کو ایک جہان نہ سمجھو بل

کہ یہ کئی جہانوں کا عظیم مجموعہ ہے۔ جمع میں افراد کا محدود و متعین ہونا ضروری نہیں لہٰذا عالمین کے لفظ نے ظاہر کر دیا کہ اس کائنات کی ہر ہر چیز کا اور تمام اسرار فطرت کا احاطہ عقل کے بس میں نہیں۔ جب مخلوقات کا یہ حال ہے تو خالق کی عظمت کا کیا کہنا، بس یوں سمجھو کہ الحمدللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہی سارے کمالات کا حقیقی مالک ہے۔ سارے جہانوں کو بہ تدریج نشو ونما دینا اور اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنا ربوبیت ہے۔ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ اس ربوبیت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں اسی نے ربوبیت اور رحمت کے تمام ظاہری و باطنی اسباب، وسائل اور ذرائع پیدا فرمائے ہیں وہی حقیقی رب ہے۔ اللہ کی پیدا کی ہوئی اس وسیع و عریض کائنات اور اس میں موجود بے جان اور جان دار اشیا پر اللہ تعالیٰ کا جو نظام ربوبیت حاوی ہے، اس کا احاطہ کرنا تو دور کی بات ہے ہم صرف ایک لقمے پر ہی غور کریں جو ہم اپنے منہ میں ڈالتے ہیں تو اس کے پیچھے لاتعداد اسباب اور مسببات کا طویل سلسلہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اس وسیع اور محیر العقول نظام ربوبیت کو دو لفظوں رب العالمین میں سمیٹ کر یہ واضح کر دیا کہ جب وہی رب ہے اور دو لفظوں الرحمن الرحیم سے یہ واضح کر دیا کہ اس کی یہ حیرت افزا ربوبیت اس کی رحمت کاملہ کی مظہر ہے تو جس طرح اللہ اپنی ذات میں لاشریک ہے اسی طرح وہ اپنی صفات اور اپنے افعال میں بھی لاشریک ہے۔ دہریت کا بھی رد ہو گیا کہ اگر دہریوں کے بقول یہ کائنات بے شعور، بے ارادہ اور بے علم مادے سے وجود میں آئی ہے تو یہ نظام ربوبیت جو نظم و ترتیب لئے ہوئے ہے، جس نے مخلوقات میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کر رکھی ہے اور اس میں ارتقا و نشو ونما کا عمل ساکن و جامد نہیں۔ بل کہ جاری و ساری ہے اور درجہ بہ درجہ متحرک نظر آتا ہے، ہرگز وجود پذیر نہ ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ اس ساری کائنات کا رب، مدبّر اور منتظم ہے تو لازماً وہ مشفق اور مہربان بھی ہے کیوں کہ پروردگار وہی ہوگا جو صفت رحمت کو بروئے کار لائے گا چناں چہ اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی اور موٹی موٹی نعمتیں تو ہر کسی کو نظر آتی ہیں لیکن اس کی باریک اور لطیف نعمتوں کا ادراک ہر کسی کو نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام نعمتوں اور احسانات کو دو کلموں الرحمن الرحیم میں سمو دیا۔ جو اللہ اتنی زبردست اور وسیع و عریض کائنات کو سنبھالتا ہے، عقل کہتی ہے کہ وہ قادر مطلق بھی ہوگا اور قوت و اقتدار کا اصل مالک وہی ہوگا اسے تین کلمات مالك يوم الدين سے واضح کر دیا۔ جس سے عقیدۂ آخرت بھی ثابت ہو گیا اطاعت و اتباع کے ابتدائی تین عوامل یا محرکات ہی عقلاً ممکن ہیں، صاحب کمال ہونا، شفق و مہربان ہونا اور صاحب قوت و اقتدار ہونا۔ اللہ تعالیٰ میں یہ اوصاف اعلیٰ درجے میں پائے جاتے ہیں، لہٰذا اطاعت و اتباع سے بڑھ کر وہ عبادت کا مستحق ہے اور اس عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں اس حقیقت کو ان کلمات میں سمو دیا، ایاك نعبدو ایاك نستعین۔ اوپر بیان ہوا تھا کہ اللہ کی بڑی

بڑی نعمتیں تو ہر کسی کو معلوم بھی ہیں اور حاصل بھی ہیں لیکن اس کی لطیف اور خاص نعمتیں ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کی خاص الخاص نعمت صراط مستقیم ہے۔ یہ ہر کسی کو حاصل نہیں بل کہ صرف ان لوگوں کو ہی حاصل ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ قرار دیا ہے۔ عیسائیوں کی دعا کے اس حصے پر غور کیجئے کہ اے اللہ! ہمیں آج کی روٹی آج ہی دے۔ روٹی تو سب کو ملتی ہے خواہ مومن ہو یا پرلے درجے کا کافر اور فاسق وفاجر ہو۔ بے شک روٹی نعمت ہے، کپڑا نعمت ہے، مکان نعمت ہے، بیوی بچے نعمت ہیں، جائیداد اور مال ومنال نعمت ہے، لیکن یہ خاص الخاص نعمتیں نہیں، جو صرف اللہ کے محبوب بندوں کی ہی حاصل ہوں۔ یہ خاص الخاص نعمت صراط مستقیم ہے چناں چہ ہمیں سکھایا گیا کہ یوں دعا مانگو اھدنا الصراط المستقیم یعنی ہمیں سیدھے راستے پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچا دے۔ ہدایت کے معنی صرف راستہ دکھانے ہی کے نہیں بل کہ اس کا دوسرا معنیٰ ہے منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ جب تک خاتمہ بالخیر نہ ہو سیدھی راہ پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچا دینے کی یہ دعا مطلوب ومقصود رہے گی۔ اسی لئے نماز کی ہر رکعت میں یہ دعا مانگی جاتی ہے۔ عیسائیوں کی دعا کا یہ حصہ کہ اے خدا! تیری بادشاہت آئے اور جس طرح تیری مرضی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو، قابل توجہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے آسمانی بادشاہت کی آمد کی بار بار اطلاع اپنے ساتھیوں کو دی تھی جیسا کہ موجودہ اناجیل سے بھی ثابت ہے اسی لئے یہ دعا عیسائیوں کو سکھائی گئی۔ اب اگر عیسائی کہتے ہیں کہ انہیں آسمانی بادشاہت حاصل ہوگئی تھی اور خدا کی مرضی زمین پر پوری ہوگئی تھی تو یہ دعا مانگنا ان کے لئے بے کار ہوا کیوں کہ جو چیز حاصل ہو چکی ہو اسے ہی بار بار مانگتے رہنا تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں۔ ثابت ہوا کہ اس آسمانی بادشاہت سے شریعت محمدیہ مراد ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کا اس شریعت کو نافذ کرنا، حکومتی وسائل اور قوت واقتدار سے اس کی نشر واشاعت کرنا اور اسے اصل اور غیر محرف صورت میں آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا مراد ہے وہ بادشاہت آچکی اور خدا کی مرضی زمین پر پوری ہو چکی۔ اب ضرورت ہے کہ اس بادشاہت کو پہچان کر اپنی زندگی کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دیا جائے۔ اللہ کی یہ مرضی یعنی شریعت محمدیہ بحمد للہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ اس پر چلنا ہی صراط مستقیم ہے بہ شرطے کہ موت بھی اسی پر واقع ہو لہٰذا اھدنا الصراط المستقیم کی دعا تاحیات درکار ہے۔ مذکورہ وضاحت سے معلوم ہوا کہ کس قدر مختصر کلمات میں توحید ذات وصفات ثابت ہوگئی۔ شرک فی الذات، شرک فی الصفات اور دہریت کی تردید بھی ہوگئی۔ عقیدۂ آخرت بھی ثابت ہوگیا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ زندگی کا مقصد اللہ کی عبادت ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اطاعت واتباع کے ابتدائی تین محرکات ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی عام نعمتیں بھی ہیں اور خاص الخاص نعمت صراط مستقیم ہے جو صرف اللہ کے انعام یافتہ

محبوب بندوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ انہیں ایک جہان نہیں بل کہ کئی جہانوں کا مجموعہ سمجھا جائے۔ اللہ کے نظام ربوبیت کا بھی علم ہوا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ زندگی بامقصد ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انصاف کا ایک دن مقرر ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یوں تو سب نعمتیں اللہ سے مطلوب ہیں لیکن خاص الخاص نعمت صراط مستقیم کو طلب کرنا چاہئے جو دوسری نعمتوں کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور جس کے بغیر انسان بدقسمت اور محروم ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اس نعمت کو پہچان لینے کے باوجود اسے ٹھکرائے وہ اللہ کے غضب کا شکار ہے اور جو اسے پہچاننے کی کوشش ہی نہ کرے وہ گم راہ اور بے خبر ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ جن لوگوں پر خدا کا غضب ہے اور جو گم راہ ہیں ان کا راستہ منزل مقصود یعنی جنت تک پہنچانے والا نہیں ہے اس لئے اس خطرناک راستے سے بچنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ میں جو اہم حقائق بیان کئے گئے ہیں، ان کے صحیح ہونے کے اجمالی دلائل بھی ان میں سمو دیئے گئے ہیں، یہ بھی پتہ چلا کہ تمام متعلقہ شبہات کا جواب بھی ان ہی دلائل کے اندر مضمر کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیوں کی نماز کے مقابلے میں قرآن کریم کی تعلیم کردہ یہ دعا تمام خوبیوں اور بھلائیوں کی جامع ہے۔ سورہ فاتحہ میں معارف واسرار کا ایک سمندر پنہاں کر دینا کیا کسی ایسے شخص کا کام ہوسکتا ہے جو اُمی ہو؟ قرآن اللہ کا کلام ہے۔

ہم سورہ فاتحہ کے معارف واسرار اسی طرح دیگر سورتوں کے معارف واسرار کا احاطہ اور استیعاب کرنے سے قاصر ہیں لیکن جو کچھ ہمیں معلوم ہوسکا ہے وہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی اور وافی ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کو پیش کرنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

ذکر الٰہی (اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے) کے جو کلمات اور صیغے ہیں انہیں دس عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ تسبیح یعنی یہ ظاہر کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب، کم زوری اور نقص سے پاک ہے۔ تحمید یعنی یہ ظاہر کرنا کہ اللہ ہی کے لئے سب عمدہ تعریفیں ہیں۔ تہلیل یعنی یہ ظاہر کرنا کہ اللہ ہی عبادت اور بندگی کے لائق ہے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ تکبیر یعنی یہ ظاہر کرنا کہ قوت وطاقت، اقتدار وتصرف اور کمال وعظمت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہی سب سے بلند اور سب سے بڑھ کر ہے۔ حوقلہ یعنی یہ ظاہر کرنا کہ نیکی کی طرف آنے کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت واستطاعت اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ ذکر کے یہ پانچوں صیغے اس کلمے میں جمع ہیں سبحان اللہ والحمدللہ ولآ الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ذکر کے یہ پانچوں صیغے دراصل الحمدللہ ہی کے تحت آتے ہیں اور اسی کی مزید تفصیل وتشریح کا کام دیتے ہیں۔ اب ہم بقیہ پانچ صیغوں کو لیتے

ہیں۔تعوذ یا استعاذہ یعنی دنیا اور آخرت کی تکلیفوں اور برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا جیسے ہم قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہتے ہیں کہ میں مردود شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔تعوذ کے اور بھی بہت سے کلمات قرآن وحدیث میں آئے ہیں۔استغفار یعنی اپنے گناہوں پر اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہونا،استغفار کے بھی متعدد کلمات قرآن وحدیث میں مذکور ہیں۔جامع الدعا یعنی دین ودنیا کی اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں اللہ تعالیٰ کو یوں پکارنا کہ دعا کے کلمات ساری ضرورتوں کا احاطہ کریں۔بہت سی جامع ادعیہ قرآن وحدیث سے ثابت ہیں مثلاً ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الأخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔اے ہمارے رب! تو ہمیں دنیا میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور ہمیں (جہنم کی) آگ سے بچالے۔ توکل یا حسبلہ یعنی یہ ظاہر کرنا کہ اے اللہ! ہم نے بہ قدر استطاعت اپنے لئے ضروری اختیاری اسباب اپنائے ہیں لیکن ان اسباب کو مہیا فرمانا اور ان میں تاثیر پیدا فرمانا ہمارا نہیں بل کہ تیرا کام ہے جیسے حسبنا اللہ ونعم الوکیل کہنا کہ اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔صلوٰۃ علی النبی (درود شریف) یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دعائے رحمت وبرکت کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وبرکت کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔غور کیا جائے تو ذکر کے ان پانچ صیغوں کا اگر ایک ہی عنوان قائم کرنا ہو تو دعا کے عنوان کے تحت ہی یہ سارے صیغے آجاتے ہیں یعنی ذکر الٰہی کی دو بڑی قسمیں حمد اور دعا ہیں۔اب مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دعا بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی حمد ہی میں شامل ہے کیوں کہ دعا مانگنے والا اللہ تعالیٰ کو تمام کمالات کا اور مخلوق کے نفع ونقصان کا حقیقی مالک سمجھتا ہے تب ہی تو وہ اس سے دعا مانگتا ہے۔یہ الفاظ دیگر ذکر کے تمام صیغوں کا آخری واحد عنوان الحمدللہ ہے۔قرآن کریم کی ترتیب توقیفی میں سب سے پہلی سورت یعنی سورہ فاتحہ کا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد آغاز الحمدللہ رب العالمین سے ہوتا ہے۔اور عالم آخرت میں حساب کتاب کے تمام مراحل جب مکمل ہوجائیں گے تو یہ اعلان کردیا جائے گا الحمدللہ رب العالمین (۵۰ ج)۔کلام میں ایسے محاسن پیدا کرنا مخلوق کی اور وہ بھی ایک اُمی انسان کے بس کی بات نہیں۔قرآن اللہ کا کلام ہے۔

ہر دیگر سورت کی طرح سورہ فاتحہ کا آغاز بھی تسمیہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) سے ہوتا ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حمد ہی کی ایک صورت ہے۔تسمیہ کے شروع میں ''ب'' لائی گئی ہے جو عربی زبان میں ربط ووصل کا معنی دیتی ہے یعنی پورے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اس کے مخاطبین کا پاکیزہ تعلق خالق کائنات سے استوار ہو۔جس طرح سورۂ فاتحہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے اسی طرح بسم اللہ (تسمیہ) کے یہ کلمات سورہ فاتحہ کا

خلاصہ ہیں۔ ان کلمات میں اللہ کے اسم ذات کے ساتھ اس کے دو جمالی نام الرحمن الرحیم لائے گئے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے کہیں بڑھ کر ہے اور سورہ فاتحہ کی ابتدا میں بھی رب العالمین اور الرحمن الرحیم کے کلمات پہلے لائے گئے ہیں یہ مشفقانہ کلمات ہیں مالك یوم الدین کے کلمات کو ان سے موخر کیا گیا ہے۔ پھر مالک یوم الدین کے کلمات میں بھی رحمت وشفقت کا پہلو یوں موجود ہے کہ یوم الدین یعنی انصاف کے دن اللہ تعالیٰ فرماں برداروں کو بہترین اجر سے نوازے گا یعنی یہ کلمات صرف عذاب کو ہی نہیں بل کہ ثواب کو بھی ظاہر کرتے ہیں یعنی اس کی رحمت اس کے غضب سے بہ ہر حال کہیں بڑھ کر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنت کی وسعت جہنم سے کہیں زیادہ ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے کہ تم اپنے رب کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف مسابقت کرو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ (۵۱/ الف)۔ جنت فرشتوں کا بھی مسکن ہے۔ فرشتوں کی کثرت تعداد کا ایک دھندلا سا تصور یوں قائم کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ اس کے محافظ فرشتوں کے علاوہ دو فرشتے عمل لکھنے والے (کراما کاتبین) بھی موجود ہوتے ہیں ان کے علاوہ جو ملائکہ ہیں وہ بھی مخلوق کے علم کے اعتبار سے لاتعداد اور بے شمار ہیں۔ اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جہنم کی نسبت جنت نہایت وسیع ہے یعنی اللہ کی مغفرت ورحمت اس کے غضب وقہر کی نسبت نہایت وسیع ہے چناں چہ سورہ مومن میں ہے کہ اس کی رحمت اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (۵۱/ ب) اسی مفہوم کو تسمیہ کے کلمات اور سورہ فاتحہ کی ابتدائی آیات بہ درجہ اتم ظاہر کر رہی ہیں۔ یہاں یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں باہم کمی بیشی نہیں بل کہ مخلوق پر ان صفات کے اثرات میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ کلام میں ایسے محاسن پیدا کرنا مخلوق کا اور وہ بھی ایک اُمی انسان کا کام نہیں ہوسکتا۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ سورہ فاتحہ کی ایجازی اور اعجازی شان کو خوب واضح کرنے کے لئے ہم نے قدرے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ جس نے سورہ فاتحہ کو صحیح سمجھ لیا، دیگر قرآنی سورتوں کا سمجھنا بھی اس کے لئے آسان ہے۔ ایجاز القرآن کا پہلا حصہ ''الف'' اختتام کو پہنچا۔ اب کچھ دیگر متعلقہ مضامین زیر بحث لائے جا رہے ہیں۔

(ب): قرآن کریم کے بعض چھوٹے چھوٹے اور مختصر جملوں سے جہاں زندگی کے ہر پہلو کے متعلق معارف ومسائل اخذ کئے جاتے ہیں، فقہی مسائل کا بھی استنباط کیا جاتا ہے۔ حال آں کہ ظاہری متن میں یہ مذکور نہیں ہوتے۔ مثلاً سورہ بقرہ کے احکام رضاعت میں ایک مختصر جملہ یہ بھی ہے لا تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده (۵۱/ ج) والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے اور نہ ہی جس کے لئے بچہ جنا گیا ہے (یعنی والد) کو کوئی نقصان پہنچایا جائے''۔ اس چھوٹے سے

قرآنی جملے سے متعدد فقہی مسائل کا استنباط کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ نسب باپ کی طرف منسوب ہوگا ماں کی طرف نہیں کیوں کہ یہاں باپ کو عربی لفظ ابٌ کی بہ جائے مولود لہ کہا گیا ہے جس کا معنی یہ ہے جس کے لئے بچہ جنا گیا۔ نیز اب کا لفظ مجازاً چچا یا کسی بھی سرپرست پر بھی بولا جاتا ہے مگر مولود لہ کے کلمات سے صرف حقیقی نسبی باپ ہی مراد لیا جاسکتا ہے اسی طرح ماں کے لئے بھی اُمٌ کی بہ جائے والدۃ کا کلمہ لایا گیا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے معاملے میں بچے کے ماں باپ آپس میں ضد نہ کریں کیوں کہ متعلقہ آیت کے مذکورہ حصے سے یہ معلوم ہورہا ہے کہ والدین میں سے کسی کو بھی بچے کی وجہ سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے سے معذور ہو یا بالفرض بغیر معذوری کے ہی انکار کردے تو باپ کو اس پر زبردستی کرنے کا اختیار نہیں، کیوں کہ بچے کی وجہ سے ماں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ چوتھا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ ماں کو اگر کوئی معذوری نہیں تو دودھ پلانے سے بلاوجہ انکار نہ کرے، کیوں کہ بچے کے باپ کو بھی بچے کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہئے۔ پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ بالفرض ماں بغیر کسی مجبوری اور عذر کے بھی بچے کو دودھ نہیں پلاتی تو بچے کے باپ سمیت کوئی بھی شخص حتیٰ کہ عدالت بھی ماں کو بچے کے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کرسکتی کیوں کہ ماں کو بچے کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ چوں کہ آیت متعلقہ کے شروع میں اللہ کا یہ حکم موجود ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں، لہٰذا اگر ماں کو کوئی عذر نہ ہو تو دودھ نہ پلانے کی صورت میں وہ اللہ کے نزدیک گناہ گار ہوگی گو دنیا میں کوئی بھی اسے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کرسکتا یعنی ماں پر دودھ پلانا فقہی اصطلاح کے اعتبار سے ''قضا'' نہیں بل کہ ''دیانۃً'' واجب ہے۔ ساتواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ بچے کی مطلقہ ماں بچے کو دودھ پلانے کی اجرت باپ سے طلب کرسکتی ہے، کیوں کہ بچہ باپ کا ہے اور ماں کو بچے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ آٹھواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی اور خاتون کم اجرت پر دودھ پلانے کے لئے تیار ہو تو بچہ اس دوسری عورت یعنی انا کے سپرد کیا جائے گا کیوں کہ بچے کی وجہ سے باپ کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ نواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی اور خاتون بچے کو بلا اجرت دودھ پلانے پر تیار ہو تو اس صورت میں بھی باپ کو نقصان سے بہ جانے کے لئے بچہ دوسری عورت کے سپرد کیا جائے گا۔ دسواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کوئی اور خاتون اور بچے کی ماں ہوں یک ساں اجرت مانگتی ہوں تو ماں کو نقصان سے بچانے کے لئے بچہ ماں کے سپرد کیا جائے گا۔ گیارہواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچے کی ماں مطلقہ نہیں یا طلاق رجعی کی عدت میں ہے تو اسے بچے کے باپ سے دودھ

پلانے کی الگ اجرت طلب کرنا درست نہیں۔ اس صورت میں اس کے خاوند پر جو نان نفقہ پہلے ہی سے شریعت نے واجب کر رکھا ہے وہی کافی ہوگا، تاکہ باپ کو بچے کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ بارہواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے مسئلے میں اگرچہ بچے کی وجہ سے ماں باپ دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے لیکن ماں کو نقصان سے بچانے کا زیادہ اہتمام کرنا چاہئے کیوں کہ آیت میں ماں کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ تیرہواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اولاد پر باپ کی نسبت ماں کا حق زیادہ ہے، کیوں کہ ماں کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔ چودھواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ ماں کا حق اولاد پر زیادہ ہے لیکن بچے کا نسب باپ کی طرف ہی منسوب ہوگا، کیوں کہ آیت میں باپ کو مولود لہ (جس کے لئے بچہ جنا گیا) کہا گیا ہے۔ پندرہواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ ماں کی رعایت اور اس کے حق کے زیادہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ باپ کو ناحق نقصان پہنچایا جائے کیوں کہ آیت میں بات اس پر ختم کی گئی ہے کہ باپ کو بچے کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ سولہواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر ماں کا دودھ بہت ہی کم ہے جو بچے کی غذائی ضرورت کو پورا نہیں کرتا اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے گھر میں کوئی اور متبادل ذریعہ بھی نہیں تو بچہ دوسری عورت (جس کا دودھ بچے کی ضرورت کے مطابق ہو) کے سپرد کیا جائے گا، کیوں کہ بچے کو بھی نقصان نہیں ہونا چاہئے اور بچہ باپ کا ہے، لہٰذا وہ دودھ پلانے کے لئے بچے کو کسی دوسری خاتون کے سپرد کر سکتا ہے۔ سترہواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر ماں بچے کو دودھ نہیں پلاتی اور یکساں اجرت پر دودھ پلانے کے لئے دو یا دو سے زیادہ خواتین دست یاب ہیں تو بچہ اس خاتون کے سپرد کیا جائے گا جسے ماں پسند کرتی ہو۔ اٹھارہواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچے کو دودھ پلانے کے لئے دو یا دو سے زیادہ خواتین دست یاب ہوں لیکن ان کی اجرت یک ساں نہیں ہے تو بچہ سب سے کم اجرت طلب کرنے والی عورت کے سپرد کیا جائے گا، خواہ ماں اس خاتون کو پسند نہ کرتی ہو، کیوں کہ بچے کی وجہ سے باپ کو نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ انیسواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ بچے کو دودھ پلانے کی اجرت باپ کے ذمے ہے کیوں کہ بچے کا نسب باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے اور بچہ اسی کا ہے۔ بیسواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ بچے کی وجہ سے جس طرح بچے کے والدین کو باہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے گریز کرنا چاہئے اسی طرح والدین کے اعزہ واقارب اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ بچے کی وجہ سے ماں یا باپ کسی کو بھی نقصان نہ پہنچے، اسی لئے آیت میں صیغہ ''لا تضار'' مجہول کا صیغہ لایا گیا ہے کہ نقصان نہ پہنچایا جائے۔ نقصان پہنچانے کے فعل کی نسبت صرف ماں باپ کی طرف نہیں کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے فرمایا یآدم اسکن انت وزوجك الجنة (۵۲/الف) ''اے آدم! تو اور تیری بیوی (دونوں) جنت میں سکونت کرو''۔ اس سے ایک فقہی مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ عائلی زندگی میں خاوند اپنے گھر کا سربراہ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت آدمؑ کو مخاطب فرمایا ہے۔ دوسرا معاشرتی اور عائلی مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ خاندانی زندگی پُرسکون ہونی چاہئے جیسا کہ لفظ ''اُسکن'' سے ظاہر ہورہا ہے۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خاوند اور بیوی دونوں اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنائیں، جیسا کہ آیت میں لفظ ''جنت'' سے ظاہر ہورہا ہے۔ چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ خاوند اور بیوی کے حقوق وفرائض اپنی جگہ پر اہم ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا حق سب سے بڑھ کر ہے لہٰذا دونوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت واطاعت پر آپس کی اپنی محبت کو مقدم نہیں رکھنا چاہئے ورنہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع کرنے کا کبھی یہ نتیجہ بھی ہوسکتا ہے کہ گھر جنت کا نمونہ بنے کی بہ جائے مصیبت خانہ بن جائے، جیسا کہ حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کو جنت سے اس لئے نکلنا پڑا کہ وہ خطائے اجتہادی کی بنا پر شجر ممنوعہ کے پاس چلے گئے پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ خاوند اگرچہ گھر کا سربراہ ہے لیکن بیوی کے حقوق بھی اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں، چناں چہ جنت میں رہنے کے لئے گو خطاب صرف حضرت آدمؑ کو ہے اور حضرت حواؑ کو ان کے تابع کیا گیا ہے لیکن جنت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے تثنیہ کا صیغہ لاکر دونوں کو یوں مخاطب کیا گیا ہے وکلا منهما رغدا حيث شيتما (۵۲/ب) اور تم دونوں وہاں (جنت) سے جو چاہو کھاؤ'' اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کھانے پینے کے لئے اپنے گھر سے خاوند کی اجازت کے بغیر بھی اپنی ضرورت کے تحت لے سکتی ہے۔ چھٹی بات یہ معلوم ہوئی کہ خاوند اگر بخیل ہو تو بیوی اپنی ضرورت کے مطابق اور خاوند کی حیثیت کے مطابق خاوند کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر لے سکتی ہے بہ شرطے کہ ضروت سے زائد اور اسراف کی نیت سے نہ لے۔ ساتویں بات یہ معلوم ہوئی کہ خاوند اور بیوی شرعی احکام کی تعمیل میں برابر کے ذمہ دار ہیں، کیوں کہ شجر ممنوعہ کے پاس نہ جانے کا حکم دیتے ہوئے بھی دونوں کو یک ساں مخاطب کیا گیا ہے ولا تقربا هذه الشجرة اور تم دونوں اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ، آٹھویں بات یہ معلوم ہوئی کہ غلطی معاف ہوجانے کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ اس غلطی کا طبعی اثر بھی ظاہر نہ ہو، چناں چہ شجر ممنوعہ کے پاس جانے کی حضرت آدمؑ وحواؑ کی اجتہادی غلطی اگرچہ معاف ہوگئی تھی لیکن زمین پر بہ ہر حال انہیں اترنا پڑا۔

سورہ نساء میں احکام وراثت کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انہیں مال متروکہ کا دو تہائی ملے گا اور اگر ایک ہی لڑکی

ہوتو اس کے لئے آدھا ہے (۵۲/ ج)۔ دیکھئے احادیثِ صحیحہ سے دولڑکیوں کا حصہ بھی دوتہائی ہے لیکن متعلقہ آیت میں دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ تو دوتہائی بتایا گیا ہے، لیکن اختصار وایجاز سے کام لیتے ہوئے دولڑکیوں کے حصے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کی ضرورت اس لئے نہیں کہ اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی وارث ہوں تو لڑکے کو دو حصے اور لڑکی کو ایک حصہ یعنی تہائی مال ملے گا۔ اب اگر لڑکا نہ ہو صرف دولڑکیاں ہوں تو ظاہر ہے کہ دونوں کو جب ایک ایک تہائی ملا تو یہ دوتہائی ہوگیا لہٰذا اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، البتہ یہ شبہہ ہوسکتا تھا کہ اگر صرف تین لڑکیاں ہوں اور لڑکا نہ ہو تو تینوں کو ایک ایک تہائی ملنے کی صورت میں سارا مال وراثت ان ہی کو مل جائے گا اور اگر تین سے بھی زائد لڑکیاں ہوں تو بھی سارا مال ان ہی میں تقسیم ہوجائے گا، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے واضح کردیا گیا کہ دو سے زائد جتنی بھی لڑکیاں ہوں سب کو مشترکہ طور پر دوتہائی ملے گا۔ یہ بھی کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ اگر صرف ایک لڑکی ہی ہو تو اسے صرف ایک تہائی مال ملنا چاہئے، لیکن یہ شبہہ بھی یہ بتا کر دور کردیا گیا کہ اگر لڑکی ایک ہی ہو تو اسے نصف مال ملے گا۔

قرآنی قصص اور واقعات میں غیر ضروری کلام سے گریز کیا گیا ہے جو جزئیات از خود سمجھی جاسکیں انہیں بیان نہیں کیا گیا۔ مثلاً سورہ یوسف میں شاہ مصر کا خواب بیان کیا گیا ہے جس کی تعبیر بتانے سے اہل دربار قاصر رہے۔ تو وہاں موجود ایک شخص نے کہا کہ میں اس خواب کی تعبیر بتلادوں گا مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔ اس کے متصلاً بعد قرآنی مضمون یوں ہے کہ اے بہت بڑے سچے یوسف ''تو مجھے اس خواب کی تعبیر بتلا..... تا آخر'' (۵۳/ الف) یہ شخص کئی برس پہلے قید خانے میں حضرت یوسف کا ساتھی رہا تھا۔ جب یہ قید سے رہا ہوا تو حضرت یوسف نے اسے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا بھی ذکر کرنا۔ لیکن یہ شخص بالکل بھول گیا۔ اب کئی سالوں کے بعد وہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لئے آیا تھا۔ قرآن کریم میں یہاں اس بات کا ذکر تک نہیں کہ اس شخص نے حضرت یوسف کا سامنا کیسے کیا ہوگا کہ قید سے رہائی پانے کے بعد وہ حضرت یوسف کا تذکرہ بادشاہ سے کرنا بھول گیا تھا اور نہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف نے اس سے اس طویل بے اعتنائی کا گلہ فرمایا ہو۔ ان جزئیات کو چھوڑ دیا گیا تا کہ لوگوں پر واضح ہو کہ حضرت یوسف نے اللہ کے نبی کی حیثیت سے اخلاق کریمانہ کی بنا پر اس شخص سے کوئی شکایت نہیں کی اور نہ ہی اسے کوئی طعنہ دیا، بل کہ فراخ دلی اور خندہ پیشانی سے اس کی بات سنی اور خواب کی تعبیر اسے بتادی۔ قرآن کریم میں ایجاز واختصار کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ کبھی تو چند کلمات میں بہت سے معانی ومفاہیم سمودیئے جاتے ہیں اور کبھی از خود سمجھ میں آنے والی جزئیات کو بیان نہیں کیا جاتا۔

(ج) قرآنی ایجاز کی ایک مثال سورہ آل عمران کی یہ آیت ہے **اللہ لآ الٰہ الا ھو الحی القیوم**

(۵۳/ب)۔یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے قائم رہنے والا (اور کائنات کو) قائم رکھنے والا ہے''۔سورہ آل عمران کی ابتدائی آیات کا شان نزول نجران کے عیسائیوں کی بہ صورتِ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری تھی۔عیسائیوں کا یہ خود ساختہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے اور خدائی اختیارات اور صفات کے مالک ہیں۔مذکورہ مختصر آیت میں عیسائیت کی پوری عمارت کو یوں زمین بوس کر دیا گیا ہے کہ اللہ کو ہر کم زوری سے پاک ہونا چاہئے۔موت مخلوق کی سب سے بڑی بے بسی ہے۔ یہ بے بسی مخلوق کے لئے عیب نہ بھی ہو لیکن خالق کائنات کے لئے تو بہ ہر حال عیب ہے۔نیز اللہ تو وہ ہے جو خود بھی قائم ودائم ہے اور پوری کائنات کو بھی سنبھالتا ہے اور ان کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ادھر حضرت عیسیٰ ہیں جو بہ قول نصاریٰ اپنے دشمن یہودیوں کے ہاتھوں مصلوب ہو گئے تھے یعنی موت سے ہم کنار ہو گئے تھے۔خدا کی یہ صفت کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، حضرت عیسیٰ میں نہیں پائی جاتی۔جسے بہ قول یہود ونصاریٰ دشمن پکڑ کر سولی پر چڑھا دے، وہ بے چارہ چھپتا پھرے لیکن دشمن گرفتار کر کے اسے جسمانی وذہنی اذیت پہچانے کے بعد مصلوب کر دے اور وہ اپنے آخری وقت میں ایلی ایلی لما شبقتنی ''اے میرے خدا، اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟'' کے الفاظ سے اپنا بندہ ہونا اور عاجز ہونا ثابت کرے اور خدا کو پکارے، تو ایسا شخص خدا کا بندہ تو ہے، خدا ہرگز نہیں ہو سکتا۔حضرت عیسیٰ عیسائی عقائد کے مطابق اپنے آپ کو نہ بچا سکے کائنات کو بھلا کیا سنبھالیں گے۔حال آں کہ خدا کو قیوم ہونا چاہئے۔

قرآن کریم میں بسا اوقات ایجاز واختصار سے کام لیتے ہوئے دعوی اور دلیل کے لئے ایک ہی عبارت لائی گئی ہے۔مثلاً سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ انصاف کے دن (یوم الدین) کا مالک ہے۔یہاں قیامت کا دن جیسے کلمات نہیں لائے گئے تاکہ قیامت پر دلیل بھی اس کے اندر ہی مضمر کر دی جائے۔قیامت اس لئے برپا ہوگی کہ ظالموں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔اپنے دعوے کو ہی بہ طور دلیل پیش کرنا کلام میں عیب سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن کریم میں ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ کلام میں عیب کی بہ جائے حسن اور نکھار پیدا ہوتا ہے۔اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً اتعبدون ماتنحتون (کیا تم اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بُت پوجتے ہو؟) یہاں یہ دعویٰ بھی موجود ہے کہ خود تراشیدہ بت مشرکوں کے باطل معبود ہیں۔دلیل بھی موجود ہے کہ کیا خود تراشیدہ بتوں کی عبادت کو عقل سلیم قبول کرتی ہے؟ ساتھ ہی بت پرستی کی مذمت اور اس پر تعجب کا اظہار بھی ہو گیا۔قرآنی ایجاز کی ان مثالوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تفصیلی دلائل نہیں دیئے ہیں۔مقصود یہ بتانا ہے کہ مختصر کلمات کسی بڑے مضمون کا عنوان بن جاتے ہیں اور اپنے اندر مفاہیم ومعانی کی وسعت سموئے ہوئے ہوتے

ہیں۔ اگر کلام میں ایجاز واختصار تعلیم وتعلم اور مشق وتربیت سے حاصل کیا جائے تو مادی اسباب پر مبنی ہونے کی وجہ سے معجزہ نہ کہلائے گا۔ لیکن ایک امّی کا اس طرح کا کلام یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوسکتا ہے۔ جہاں تک کسی پوری قرآنی سورت مثلاً سورہ فاتحہ کا تعلق ہے تو اس کی نظیر پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں لا سکتے۔ چناں چہ سورہ فاتحہ کے گزشتہ مباحث اس حقیقت کو بہ خوبی المنشرح کر رہے ہیں۔

بُرھان القرآن

اخبار القرآن (اخبار عن المغیبات) اور ایجاز القرآن کی طرح بُرھان القرآن (قرآنی استدلال) بھی قرآن کریم کے معجزہ ہونے پر زبردست دلیل ہے۔ سورہ حٰم السجدہ میں ہے کہ ''بے شک جو لوگ ہماری آیتوں میں الحاد (کجروی) کرتے ہیں وہ ہم پر پوشیدہ نہیں ہیں (ایسے لوگ قرآن کریم میں معنوی تحریف کر کے اپنے آپ کو جہنم کا سزاوار ٹھہرا رہے ہیں تو) جو آگ میں ڈالا جائے وہ اچھا ہے یا وہ جو امن وامان کے ساتھ قیامت کے دن آئے۔ تم جو چاہو کرتے چلے جاؤ وہ تمہارے سب اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں نے اپنے پاس نصیحت (قرآن) پہنچ جانے کے باوجود اس سے کفر کیا (وہ بھی ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں) اور بلاشبہ یہ بڑی باوقعت کتاب ہے جس کے پاس باطل کا گزر نہ سامنے سے نہ پیچھے سے (یعنی کہیں بھی اور کبھی بھی) نہیں ہوسکتا۔ یہ صاحب حکمت اور قابل تعریف (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے اتارا ہوا ہے''۔ (۵۳/ج)

قرآن کریم میں عقائد توحید، رسالت، آخرت اور ان کے لازمی تقاضوں کو ثابت کرنے کے لئے نہایت محکم اور ناقابل تردید عقلی، نقلی اور مشاہداتی دلائل قائم کئے گئے ہیں۔ عقلی دلائل کا تعلق عقل وبصیرت سے معلوم کردہ حقائق پر ہوتا ہے۔ نقلی دلائل کی بنیاد سچی خبروں پر ہوتی ہے جو ہم تک دوسروں سے منتقل ہوتی ہیں۔ مشاہداتی دلائل کی بنیاد حواس سلیمہ کے محسوسات اور مشاہدات وتجربات پر ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں استدلال کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے اس میں عقلی دلائل کو مقدم رکھا گیا ہے کیوں کہ جن لوگوں کا قرآن پر سرے سے ایمان ہی نہیں، انہیں پہلے مستحکم عقلی دلائل سے ہی قائل کیا جائے گا۔ اس کے بعد انہیں یہ سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی کہ چوں کہ قرآن کریم اور عقل سلیم میں ہرگز کوئی تعارض، تصادم اور ٹکراؤ نہیں ہے لہٰذا جو حقائق اس میں مذکور ہیں انہیں کسی تحریف اور فاسد تاویل کے بغیر قبول کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ عقلی دلیل کی تقدیم ایک خاص ضرورت اور حیثیت سے ہے۔ یہاں تقدیم کو ہم ترجیح کے معنی میں نہیں لے رہے۔ نقلی دلیل سچی خبر پر مبنی ہوتی ہے اور عقلی دلیل میں خطا کا احتمال ہوتا ہے لہٰذا قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ

یعنی یقینی نقلی دلیل کو تعارض واختلاف کی صورت میں عقلی دلیل پر ترجیح حاصل ہوگی۔ اس لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ عقلی دلائل کا ماخذ ومصدر بھی قرآن کریم کو ہی ٹھہرایا جائے اور اسی سے رہنمائی حاصل کر کے مخاطب کے ذہن میں عقلی دلیل کو ثبت کیا جائے اور پھر اسے قرآن کریم کے متعلقہ مضامین میں غور وفکر کی دعوت دی جائے۔ چناں چہ سورہ فاتحہ میں یہی کیا گیا ہے کہ اس کی ابتدائی آیات میں عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت کے لائق ہے۔ اس کے بعد منعم علیہم (انعام یافتہ) لوگوں کے سیدھے راستے کو مطلوب ومقصود ٹھہرا کر نقلی دلائل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ صراط مستقیم پر چلنے کے لئے منعم علیہم لوگوں سے ہی سیدھے راستے کا علم ہو سکے گا۔ اس کے لئے تنہا عقل کی راہ نمائی کافی نہیں بل کہ خود عقل کو راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ الغرض بعض حیثیتوں سے عقلی دلائل کو مقدم رکھنا ہوگا۔ صحیح طریقہ اپنانے سے قرآن کریم کی آیات میں معنوی تحریف اور دور از کار فاسد تاویلات کا دروازہ پہلے ہی بند کر دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اگرچہ عقلی استدلال کے سب ہی طریقوں کو کم وبیش استعمال کیا گیا ہے اور ہم مناسب مقام پر اسے زیر بحث لائیں گے، لیکن سب سے زیادہ تشقیق جدلی کے انداز کی جانب راہ نمائی کی گئی ہے۔ یہ طریقہ دل چسپ اور منفرد ہوتا ہے اور اس میں خطا کا احتمال بھی نسبتاً بہت کم ہوتا ہے۔ تشقیق جدلی میں یہاں جدل سے مراد بحث ومباحثہ ہے۔ اس طریقے میں کسی بھی زیر بحث مسئلے کی ممکنہ یا موجود شقوں (پہلوؤں) کو فرداً فرداً زیر بحث لایا جاتا ہے اور حقیقت تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ تمام عقلی علوم مثلاً ریاضی میں یہ طریقہ بہ کثرت مستعمل ہے۔ مثلاً انیس کا عدد یا جفت ہے یا طاق ہے۔ چوں کہ یہ عدد پر پورا تقسیم نہیں ہوتا لہٰذا اس کے جفت ہونے کی شق غلط ثابت ہوگئی اور چوں کہ یہاں تیسری کوئی اور شق موجود ہی نہیں ہے اس لئے انیس کے عدد کا طاق ہونا ثابت ہوگیا۔ دینی اصول وفروغ میں بھی تشقیق جدلی کا طریقہ اپنایا جاتا ہے جسے ہم نے ایجاز القرآن کے عنوان کے تحت سورہ فاتحہ کے مباحث میں بھی اختیار کیا تھا۔ سورہ فاتحہ کی ابتدائی آیات میں تشقیق جدلی سے کام لیا گیا ہے۔ سورہ فاتحہ کے کلمات الحمدللہ رب العالمین کے تحت اللہ تعالیٰ کی توحید ذات پر جو عقلی دلائل قائم کئے گئے تھے تقریباً ان سب میں یہی طریق کار فرما ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا اولیں پیغام یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں مخلوق کو شریک ٹھہرانا اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑا، بدترین اور نہایت ہی مہلک گناہ ہے۔ اگر کسی کی موت خدانخواستہ شرک پر واقع ہو جائے تو تمام پیغمبروں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی اپنی امتوں کو یہ پیغام نہایت ہی اہتمام، تفصیل اور وضاحت سے اور نہایت ہی مستحکم دلائل کے

ساتھ دیا جاتا رہا ہے کہ ایسے شخص کی ہرگز ہرگز مغفرت نہیں ہوگی۔ جہنم میں ایسے بدقسمت کا داخلہ یقینی اور قطعی ہے۔ شرک کے علاوہ باقی گناہوں کو اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے گا معاف فرمادے گا۔ جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ مخلوق میں سے کسی کو (معاذ اللہ) مختارِ کل، عالم الغیب، حاضر وناظر اور حضرات انبیاء علیہم السلام کو مافوق البشر سمجھنے کی سنگین فکری واعتقادی لغزشوں میں کوئی مبتلا ہوجائے تو ایسا شخص اسے مافوق الاسباب (امور غیر عادیہ) میں حاجت روا سمجھ کر اپنی حاجتوں میں اس سے مدد طلب کرتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے اسے پکارتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ مخلوق کے ساتھ خالق کو بھی ملا کر دونوں سے یہی رویہ اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ دونوں ہی صورتیں سخت ناقابل قبول اور انتہائی مردود ہیں۔ مثلاً سورہ حج میں ہے کہ اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو، تم جن کو بھی اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ہرگز ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ وہ سب کے سب (اس کام کے لئے) اکٹھے بھی ہوجائیں اور اگر مکھی کوئی چیز ان سے لے بھاگے تو یہ تو اسے بھی اس سے چھین نہیں سکتے (اللہ کے مقابلے میں) بڑا ہی کم زور ہے (غیر اللہ سے) مانگنے والا اور بڑا ہی کم زور ہے جس سے مانگا جارہا ہے (۵۳/د) اور مثلاً سورہ مومن میں ہے کہ (جہنمیوں سے کہا جائے گا) اس سزا کی وجہ یہ ہے جب صرف ایک اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم نہیں مانتے تھے اور جب اس کے ساتھ (مخلوق کو بھی) شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے تو آج فیصلہ اللہ ہی کا ہے جو نہایت بلند (شان والا) اور (قوت واقتدار اور تصرف واختیار میں) نہایت بڑا ہے۔ (۵۴/الف) دیگر آسمانی کتب کی طرح سارا قرآن عقیدۂ توحید اور اس کے لازمی تقاضوں کے بیان سے بھرا پڑا ہے۔ قرآن کریم سے ماخوذ عقلی اور نقلی دلائل کو ہم آہنگ کرنے سے نوع انسانی کی جو صحیح راہ نمائی ہوتی ہے۔ اس سے قرآن کریم کا استدلالی حیثیت سے معجزہ ہونا بھی اظہر من الشمس ہوجاتا ہے۔ متعدد فکری لغزشوں کو تشقیق جدلی کے تحت زیر بحث لانے سے پہلے چند حقائق بہ طور مقدمہ وتمہید پیش کئے جاتے ہیں۔

تمہیدی مضامین: (الف)۔ اللہ تعالیٰ مختار کل، قوی اور غالب ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ بے نیاز ہے۔ تمام اچھی تعریفیں اسی کے لئے ہیں اور تمام کمالات کا وہ حقیقی مالک ہے۔ وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں، مثلاً سورہ انبیاء میں ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے متعلق اس سے پوچھا نہیں جاسکتا اور لوگوں سے (جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کے متعلق ان سے) پوچھا جائے گا (۵۴/ب)۔ اور مثلاً سورہ ابراہیم میں ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے (۵۴/ج)۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت (چاہنے) کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی طرف (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یہود ونصاریٰ کی طرح جھوٹ، فریب عہد شکنی، ظلم وتعدی اور ذہول ونسیان جیسے عیوب ونقائص منسوب کرکے یہ کہہ دیا جائے کہ اللہ جو چاہے کرے ہم کیا

کر سکتے ہیں؟ محرف بائبل اس طرح کے لغو اور جھوٹے مضامین سے بھری پڑی ہے۔ عقل سلیم کا بدیہی فیصلہ یہ ہے کہ خالق کائنات کو ہر عیب، کمزوری اور نقص سے پاک ہونا چاہئے۔ سارا قرآن ان مضامین سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ ہر عیب سے پاک ہے مثلاً سورہ نساء میں ہے کہ اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اگر نیکی ہو تو وہ اسے کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور وہ اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے (۵۵/ الف)۔ اور مثلاً سورہ زمر میں ہے کہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ (۵۵/ ب)۔ اور مثلاً سورہ طہ میں ہے کہ (حضرت موسیٰ نے فرعون کو دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا تھا کہ) میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے (۵۵/ ج) اور مثلاً سورہ مریم میں ہے کہ تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے۔ (۵۶/ الف) اور مثلاً سورہ الصافات میں ہے کہ تیرا رب جو عزت والا رب ہے ہر اس عیب سے پاک ہے جو یہ (مشرکین) اس کے متعلق بیان کرتے ہیں اور (اللہ کے سیدھے راستے کی دعوت دینے والے) پیغمبروں پر (اللہ کا) سلام ہے اور تمام کمالات اللہ ہی کے لئے ہیں جو جہانوں کا پروردگار ہے۔ (۵۶/ ب)۔ محرف بائبل کے برعکس قرآن کریم میں، ہرگز اس طرح کا مضمون نہیں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ نبیوں کو اور نیک بندوں کو (معاذ اللہ) دھوکہ دیتا ہے۔ وہ صرف دھوکے باز منافقوں کو اس معنیٰ میں دھوکہ دیتا ہے کہ وہ انہیں ان کے دھوکے کی قرار واقعی سزا دے گا۔ قرآن کریم میں ہرگز اس طرح کا مضمون نہیں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ نبیوں کو اور نیک لوگوں کو (معاذ اللہ) گم راہ کرتا ہے یا اس کے نبی (معاذ اللہ) لوگوں کو گم راہ کرتے ہیں۔ وہ صرف ظالموں اور کافروں کو اس معنی میں گم راہ کرتا ہے کہ ہدایت اور گم راہی دونوں کے اسباب اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور انہیں موثر بھی وہی بناتا ہے۔ ظالموں کو گم راہ کرنے کا کام وہ شیاطین سے لیتا ہے نبیوں اور نیک بندوں سے ہرگز ہرگز نہیں لیتا۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کسی برائی کو منسوب کر کے یہ کہنا کہ وہ جو چاہے کرے، پرلے درجے کی گم راہی ہے۔

(ب) تمام چیزیں خواہ وہ حسّی یعنی حواس سلیمہ سے محسوس ہونے والی مادی اشیا ہوں یا عقل وبصیرت سے معلوم ہونے والی معنوی اشیا ہوں، سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان، بیوی بچے، مال ومنال، جائداد وغیرہ حسی اشیا کی مثالیں ہیں۔ علم وعقل، ذہانت وفطانت، قول اور وعدے کی پختگی وغیرہ معنوی اشیا ہیں۔ اللہ نے جو کچھ بھی پیدا فرمایا ہے وہ اس کے لئے نہ مفید ہے نہ مضر ہے، اس کے لئے نہ وہ اچھا ہے اور نہ ہی برا ہے۔ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ اسے نہ کسی نفع کی حاجت ہے اور نہ ہی اسے کوئی ضرر لاحق ہو سکتا ہے۔ کسی بھی چیز کا خیر یا شر ہونا، مفید یا مضر ہونا مخلوق کے اعتبار سے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیا علیہم السلام کے ذریعہ جن وانس کو خبردار کیا ہے کہ میری پیدا کی ہوئی

فلاں فلاں حسّی اور معنوی اشیا تمہارے لئے مفید اور فلاں فلاں اشیا نقصان دہ ہیں۔ فلاں چیز یا فلاں کام تمہارے لئے حلال اور فلاں حرام ہے۔ فلاں چیز یا فلاں کام تمہارے لئے جائز اور فلاں ناجائز ہے۔ اس نے بتادیا ہے کہ مخلوق کو سوچنے سمجھنے، بھاگ دوڑ اور کام کاج کی صلاحیتیں اسی نے دی ہیں۔ اسی نے ان صلاحیتوں اور قوتوں کو پیدا کیا ہے اور اسی نے انہیں موثر بنایا ہے۔ ان صلاحیتوں، قوتوں اور اس کے پیدا کئے ہوئے اسباب کو فلاں فلاں کام میں لگانا تمہارے لئے مضر اور فلاں فلاں کام میں لگانا نفع بخش ہے۔ یوں اس نے اپنے بندوں پر حجت تمام فرمادی ہے۔ تاکہ کل کلاں بہ روز قیامت وہ یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں علم نہیں تھا۔ اس وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کفار اور فساق وفجار کو بھی جو دنیوی بھرپور مفادات حاصل ہیں، بل کہ مسلمانوں سے کہیں زیادہ حاصل ہیں، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم، مشیت اور حکمت کے عین مطابق ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے کئی کاموں کی حکمتیں لوگوں کو معلوم نہ ہوں یا ان کی عقل سے بالاتر ہوں اس لئے اس پر کوئی الزام نہیں اور وہ کسی عیب اور نقص سے آلودہ نہیں کہ کوئی احمق اس کی طرف (معاذ اللہ) ظلم کی نسبت کرے وہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ الغرض تمام حسّی ومعنوی اشیا کا پیدا کرنے والا وہی ہے اور ان میں اچھی یا بری تاثیر پیدا کرنے والا اور رکھنے والا بھی وہی ہے۔ اس نے اپنے بہت سے کاموں کی حکمت اور وجہ لوگوں کو بتا بھی دی ہے، مثلاً سورہ شوریٰ میں ہے کہ تمہیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کا بدلہ ہے اور بہت سی باتوں سے تو وہ (ویسے ہی) درگزر فرمادیتا ہے۔ (۵۶/ج) اس نے یہ بھی بتادیا ہے کہ اسلام (فرماں برداری) کا دعویٰ کرنے کے باوجود جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں، اس پر اللہ ناراض ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ صف میں ہے کہ اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، جو تم کرتے نہیں اس کا کہنا اللہ کو بہت ناپسند ہے۔ (۵۷/الف) اس نے یہ بھی بتادیا ہے کہ وہ کبھی تمہیں مصیبت وتکلیف میں آزمائش کے لئے بھی ڈالتا ہے۔ تاکہ حضرات انبیا علیہم السلام اور ان کے سچے پیروکار لوگوں کے لئے خوش حالی اور تنگ دستی، امن اور خوف، صحت اور مرض، غنا اور فقر الغرض ہر دنیوی نفع ونقصان میں اور ہر طرح کے حالات میں نمونۂ عمل بن سکیں۔ یہ آزمائشیں اس لئے بھی ہوتی ہیں کہ ان سے وہ مخلص کو منافق سے، کھرے کو کھوٹے سے، صالح کو فاسق سے، خالی جذباتی نعرے لگانے والوں اور بلند بانگ دعوے کرنے والوں کو سچے اور صحیح باعمل افراد سے ممتاز کردے۔ جیسے اس نے مثلاً احد، خندق اور تبوک کے غزوات میں کھرے کو کھوٹے سے الگ کردکھایا اس نے یہ بھی بتادیا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام لوگ ایک ہی راستے پر چل پڑتے تو ہم تو کفار کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں وغیرہ

چاندی کی بنا دیتے، بل کہ دنیوی رونق کا اور بھی بہت بہت سامان دیتے پھر بھی یہ سب کچھ دنیوی سامان ہی ہوتا۔ پرہیز گاروں کے لئے آخرت (دنیا سے) بہت بہتر ہے۔ (۵۷/ب) یہ بھی بتا دیا کہ کافروں کا شہروں میں ٹھاٹھ سے گھومنا تجھے ہرگز دھوکے میں نہ ڈال دے۔ (۵۷/ج) یہ بھی بتا دیا کہ کافروں کے لئے صرف دنیا کا ہی (آخرت کے مقابلے میں) تھوڑا سا سامان ہے پھر میں انہیں جہنم کے عذاب کی طرف کھینچ لوں گا۔ (۵۸/الف) یہ بھی بتا دیا کہ اگر تم (سچے) مومن بنو تو تم ہی غالب رہو گے۔ (۵۸/ب)

اگر وہ کسی کام کی حکمت اور وجہ نہ بتائے تو اسے اس کا بھی مکمل اختیار ہے۔ اس وضاحت کے بعد ہم مثلاً بلا خوف وخطر کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے برے اعمال کی وجہ سے اللہ نے ہمیں برے دن دکھائے ہیں۔ کفار کا خوف اور غلبہ اس نے ہم پر مسلط کر دیا ہے۔ لیکن اس طرح کی بات ہم پیغمبروں مثلاً خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہرگز ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ پیغمبر شریعت کا سب سے پہلے پابند ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ انعام میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو (لوگوں سے) کہہ دے کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں (خود) سب سے پہلا اللہ کا فرماں بردار بنوں (۵۸/ج) اور مثلاً اسی سورت میں ہے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں اور اسی بات (کو لوگوں تک پہنچانے) کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اللہ کا مُسلم (فرماں بردار) ہوں۔ (۵۹/الف)۔ پس سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اللہ کا رسول خلافِ شریعت کام کرے لیکن اللہ تعالیٰ کسی شریعت کا پابند نہیں۔ کسی بڑے سے بڑے فاسق وفاجر مسلمان کے خلاف بھی کفار کو مدد پہنچانا، مسلمانوں کے خلاف انہیں فنونِ حرب اور سامان جنگ اسلحہ وغیرہ فراہم کرنا یا کسی بھی طریقے سے ان کے ذریعے مسلمانوں کو دیدہ ودانستہ نقصان پہنچانا، مسلمانوں کو ان کے حوالے کر دینا کہ وہ ان پر ظلم وتشدد کریں یا قتل تک کر دیں، بدترین قسم کا گناہ کبیرہ اور مسلمانوں اور ان کے مفادات سے سنگین غداری اور بے وفائی ہے چہ جائے کہ ایسے کاموں کی نسبت کسی پیغمبر خصوصاً سید المرسلین کی طرف زبانِ قال یا زبانِ حال سے کر دی جائے۔

(ج) رسول چوں کہ لوگوں کے لئے نمونۂ عمل ہوتا ہے اس لئے اگر اس کا کوئی کام بہ ظاہر خلافِ شریعت نظر آئے تو لازماً لوگوں پر اس کی وضاحت کر دی جاتی ہے البتہ ہر شرعی حکم کی حکمت بتانا ہرگز اس کے ذمہ نہیں۔ مثلاً غزوۂ حنین واوطاس کے غنائم میں سے غزوات میں اصل شریک انصارِ مدینہ کو ایک دانہ تک نہیں دیا گیا اور مکے کے نومسلموں کے گھر ان اموال غنیمت سے بھر دیئے گئے۔ یہ کام بہ ظاہر خلاف شریعت نظر آ رہا تھا اور نوجوان انصار حیرت زدہ تھے کہ اصل مستحقین کو کیوں یک سر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرما دی کہ ایسا کرنے سے نومسلموں کی تالیفِ قلب (دل جوئی)

مقصود ہے۔ تاکہ انہیں اسلام میں رسوخ اور پختگی حاصل ہو جائے۔ یہ لوگ تو بھیڑ بکریاں لے کر جا رہے ہیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کے رسول کو لے کر جاؤ گے۔ اس پر انصارِ مدینہ نہ صرف پوری طرح مطمئن ہل کہ نہایت خوش بھی ہوئے۔ یا مثلاً دیکھئے حضرت خضرؑ اگرچہ کوئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے اور نہ ہی ان کی کوئی امت تھی۔ اس کے باوجود جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے کام بہ ظاہر خلاف شریعت نظر آئے تو بعد میں حضرت خضرؑ نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کی وضاحت کر کے حضرت موسیٰؑ کو مطمئن کیا جائے۔ جب یہ معلوم ہو چکا کہ پیغمبر ہرگز خلاف شریعت کام نہیں کرتا، بل کہ وہ تو شریعت کا اولیں پابند ہوتا ہے۔ پابندی اور اختیارِ کُلی ایک دوسرے کی ضد ہیں، لہٰذا پیغمبر مختار کل نہیں ہوتا اور اس کے اپنے ہر ایسے قول و فعل کی یقیناً وضاحت کر دی جاتی ہے، جو بہ ظاہر خلافِ شریعت نظر آتا ہو۔ اب دیکھئے مثلاً مدنی دور میں سانحہ بئرِ معونہ کا سبب یہ بنا تھا کہ ابو براء عامر بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اگر آپ اپنے کچھ اصحاب کو اہل نجد کے علاقے میں بھیج دیں تو مجھے بڑی امید ہے کہ وہ لوگ آپ کی دعوت کو قبول کر لیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اپنے صحابہؓ پر اہل نجد سے خطرہ ہے۔ ابو براء نے کہا کہ وہ میری پناہ میں ہوں گے۔ یہ شخص جھوٹا، مکار و عیار، سنگ دل اور فتنہ جو تھا۔ یہ بدطینت اور بدنیت تھا۔ آپ نے اس کی باتوں کا اعتبار کر لیا اور اس کے ہم راہ اپنے ستر بہترین قاری حضرات بھجوا دیئے، جب وہ معونہ کے کنویں کے پاس پہنچے تو ان سب کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ صرف ایک صاحب زندہ بچے۔ اب اگر کوئی بھی شخص مثلاً زید یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم جمیع ما کان و ما یکون اور حاضر و ناظر ہونے کی حیثیت سے سارے حالات کا پہلے ہی علم تھا۔ آپ نے ان صحابہ کرامؓ کو بہ قول زید شہید ہونے کے لئے بھیجا تھا اور بہ قول اس کے آپ راضی بہ قضا تھے، کیوں کہ شہادت ان حضرات کی تقدیر میں تھی۔ زید کی ان باتوں سے نہایت ہی سنگین خرابیاں لازم آتی ہیں۔ اولاً کسی دھوکے باز کی دیدہ و دانستہ یوں بات مان کر اس کے خبیث عزائم کو پورا ہونے دینا شریعت کی بدترین خلاف ورزی ہے اس سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) ظالموں کی مجرمانہ اعانت کا الزام عائد ہوتا ہے۔ یہاں رضا بالقضاء کا عذر محض ایک دھوکہ اور مغالطہ ہے۔ جو شخص بھی خلاف شریعت کام کرے تو وہ اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے تب ہی تو وہ یہ کام کرتا ہے۔ کوئی چور چوری کرے تو یہ اس کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے۔ اب اگر وہ یہ کہے کہ میں اپنی اس تقدیر پر راضی ہوں تو یہ ہرگز ہرگز وہ رضا بالقضاء نہیں ہے جو شریعت میں مطلوب ہے۔ رضا بالقضاء کا مطلب تو یہ ہے کہ کسی مسلمان کو کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے، اس کا کسی طرح کا دنیوی نقصان ہو جائے تو وہ اللہ کی رضا کے لئے صبر سے کام لے کہ میری قسمت میں یہی لکھا تھا اور اس پر میرا

رب مجھے بے حد وحساب اجر سے نوازے گا۔ یہ رضا بالقضاء تو بہت سے امور میں انسان کے مجبور ہونے کی دلیل ہے نہ کہ مختار کل ہونے کی، ورنہ وہ مصیبت اور نقصان کو پہلے ہی سے ٹال لیتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا بالقضاء بھی اسی معنیٰ میں ہے کہ آپ بھی مختار کل نہیں تھے۔ اسی طرح شہید ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی حفاظتِ خود اختیاری کا اہتمام کئے بغیر اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ آسانی سے بلا روک ٹوک جسمانی وذہنی اذیت پہنچائے یا قتل کر ڈالے۔ ایسا کرنا تو سراسر خلافِ شریعت اور خودکشی کے مترادف ہے، چہ جائے کہ اسے شہادت کا نام دیا جائے۔ کسی کو شہید کرانے کا مطلب بھی ہرگز یہ نہیں ہے کہ کسی کو اس کی حفاظت کا حتی المقدور انتظام کئے بغیر دشمنوں کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ اسے اذیت پہنچائیں یا قتل کر ڈالیں یہ تو سراسر ظلم اور خلاف شریعت ہے۔ یہ تو عام لوگوں کے لئے بھی بدترین گناہ ہے چہ جائے کہ اس کی نسبت (معاذ اللہ) سید المرسلین کی طرف کر دی جائے۔ دیکھئے حضرت زیدؓ بن حارثہ کی زیرِ قیادت سریہ موتہ کے لئے لشکر روانہ کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر زیدؓ قتل کر دیئے جائیں تو جعفرؓ بن ابی طالب، اور جعفر قتل کر دیئے جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ سپہ سالار ہوں گے۔ (۵۹/ب) یہ حضرات حتی الامکان اپنی حفاظت کرتے ہوئے اور دشمن کے حملوں کی بھرپور مدافعت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ یہ نہیں کہ انہوں نے لڑے بھڑے بغیر اپنے آپ کو بہ رضا ورغبت دشمن کے حوالے کر دیا ہو کہ ہمیں شہید کر ڈالو۔ ثانیاً اگر بئر معونہ کے سانحے کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل محض بہ ظاہر خلافِ شریعت تھا، بہ لحاظ حقیقت نہیں تو آپ کا یہ منصبی فریضہ تھا کہ آپ صاف بتا دیتے کہ میں عالم الغیب اور حاضر وناظر ہوں جو کچھ تمہیں خلافِ شریعت نظر آ رہا ہے حقیقت اس کے برعکس ہے۔ لیکن آپ نے یہ بات ہرگز بئر معونہ کے مظلوم شہدا کو نہیں بتائی جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ بہ وقت شہادت انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ! ہمارے حال سے ہمارے نبی کو باخبر کر دے کہ اللہ ہم سے راضی ہوا اور ہم اللہ سے راضی ہوئے (۵۹/ج) عالم الغیب اور حاضر ناظر کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ثالثاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام عائد ہوگا کہ آپ نے (مفروضہ) صحیح عقائد کی تعلیم (معاذ اللہ) اپنے عزیز ترین اصحاب کو ان کی زندگی کے آخری لمحات تک نہیں دی تھی۔ یوں آپ پر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کتمانِ علم کا الزام بھی عائد ہوگا۔ رابعاً آپ پر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع اور بناوٹ کا الزام بھی عائد ہوگا کہ سب کچھ پیشگی معلوم ہونے کے باوجود اس طرح کے واقعات وحوادث میں ایسا رویہ اختیار فرمایا، گویا آپ کو کچھ معلوم ہی نہ تھا۔ اس طرح کے واقعات وحوادث میں حضرت عائشہ صدیقہؓ پر

منافقین کی سازش سے غزوہ مریسیع کے ایام میں لگائے جانے والے بہتان کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جس میں آپ اور صحابہ کرامؓ کو کوئی ایک ماہ تک سخت الجھن اور پریشانی رہی۔ آیات برأت کے نزول سے پہلے تک خصوصاً حضرت عائشہؓ کے لئے یہ سانحہ تو سخت روح فرسا رہا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا اور دن رات رونے دھونے میں گزرتے رہے۔ حضرت عائشہؓ کو آپ نے کبھی بتایا ہوتا کہ میں عالم الغیب اور حاضر ناظر ہوں، مجھے تمہاری پاک دامنی کا سو فیصد یقین ہے اور مجھے یہ بھی یقین کامل ہے کہ گفتگو وغیرہ میں غیر شعوری طور پر بھی تم سے ہرگز کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تو بھلا حضرت عائشہؓ کیوں رونے دھونے میں دن گزارتیں؟ خامساً غیر مسلموں مثلاً یہود و نصاریٰ کو یہ کہنے کا خوب خوب موقع فراہم ہوگا کہ مسلمان اپنے پیغمبر کو رحمۃ لعالمین کہتے ہیں لیکن (مفروضہ) عقائد کی رو سے تو وہ اپنی ازواج مطہرات اور اپنے اصحاب تک کے لئے بھی (معاذ اللہ) رحمت ثابت نہیں ہوئے بل کہ انہیں (مفروضہ) صحیح عقائد کی تعلیم بھی نہیں دی بل کہ (معاذ اللہ) تصنع اور بناوٹ سے کام لیتے ہوئے انہیں اذیت پہنچائی۔ سادساً قرآن کریم میں الوہیتِ مسیح کی تردید کے لئے یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم صدیقہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ (۶۰/ب) جو غذا کا محتاج ہو وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ عیسائیوں کو بھی یہ کہنے کا موقع خوب فراہم ہوگا کہ حضرت عیسیٰؑ قطعاً غذا کے محتاج نہ تھے بل کہ وہ تو تعلیم امت کے لئے کھانا کھاتے تھے، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ کھانا دائیں ہاتھ سے کھایا جاتا ہے اور کھانے سے پہلے اللہ کا نام لیا جاتا ہے وغیرہ۔ سابعاً عام فاسق وفاجر لوگوں کو عموماً اور نبوت وولایت کے جھوٹے دعوے داروں کو خصوصاً اپنے خلافِ شریعت کاموں کا خوب جواز ملے گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) خلاف شریعت کام کیا کرتے تھے اس لئے ہم پر بھی کوئی الزام نہیں۔ جن (مفروضہ) عقائد سے ایسی خرابیاں لازم آتی ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین ہوتی ہو، انہیں اسلامی عقائد قرار دینا عجیب کج فہمی ہے۔

(د) مذکورہ بالا مباحث سے بخوبی واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی ملحد اللہ تعالیٰ کی مشئیت مطلقہ کی آڑ میں اس کی طرف عیوب ونقائص منسوب کرکے یوں کہے کہ اللہ اپنی مرضی کا مالک ہے جو چاہے کرے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مشئیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی کو خلاف شریعت کام کرنے کا جواز اس بہانے سے حاصل ہوجائے کہ اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ہم یہ کام نہ کرتے۔ یہی وہ گمراہی ہے جس میں مشرکین مبتلا رہے ہیں۔ سورہ انعام میں ہے کہ یہ مشرکین کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے باپ دادا (شرک کرتے) اور نہ ہم کسی (حلال) چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح سے جو لوگ پہلے

گزر چکے ہیں، انہوں نے (پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ کیا تمہارے پاس کوئی (صحیح) دلیل ہے تو اسے ہمارے روبرو ظاہر کرو۔ تم لوگ بالکل خیالی باتوں پر چلتے ہو اور بالکل اٹکل سے باتیں بناتے ہو۔ تو کہہ دے کہ پوری حجت اللہ ہی کی رہی، تو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو سیدھی راہ پر چلا دیتا (۶۰/ب) اور سورہ نحل میں ہے کہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے سوا کسی اور کی عبادت ہی نہ کرتے نہ اس کے فرمان کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے۔ یہی قول ان سے پہلے لوگوں کا رہا پس رسولوں کے ذمے تو کھلم کھلا (اللہ کے پیغامات کو لوگوں تک) پہنچا دینا ہے۔ (۶۰/ج) اللہ کی مشیت کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ قادر مطلق ہے، مجبور و بے بس نہیں ہے۔ سارے جن وانس بھی اس کی بغاوت اور نافرمانی پر اتر آئیں اور وہ فوراً ان کا مواخذہ نہ کرے تو اس سے (معاذ اللہ) وہ عاجز و مجبور نہیں ہو گیا۔ وہ چاہے تو سب کو زبردستی ہدایت پر لے آئے یا ان کے دلوں کو بدل کر ہدایت پر آمادہ کر دے لیکن حکیم وعلیم ہونے کی بنا پر وہ ایسا چاہتا نہیں۔ اس نے انصاف کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ اس سے پہلے وہ اکثر و بیشتر لوگوں کو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اور کبھی وہ دنیا میں بھی اپنے عذاب کا نمونہ دکھا دیتا ہے جیسے امم سابقہ میں سے قوم عاد، قوم ثمود اور آل فرعون وغیرہ کو اس عذاب کا سامنا کرنا پڑا۔ پس اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو ان کے کفر اور بدعملیوں پر ڈھیل دینا کسی جبر کے تحت نہیں بل کہ عین اس کی مشیت کے مطابق ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس مشیت کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ان کے کفر اور برے عملوں پر راضی بھی ہے۔ پس ہمیں اللہ تعالیٰ کی مشیت کو نہیں بل کہ شریعت کو مدنظر رکھنا ہے۔ شریعت کی اتباع پر اللہ تعالیٰ راضی ہے اور اس کی خلاف ورزی پر وہ ناراض ہوتا ہے بالفاظ دیگر ہم اللہ کی مشیت وتقدیر کے مسئلے میں الجھنے کی بہ جائے شریعت کے پابند ہیں۔ اللہ کی مشیت اور رضا میں مخلوق کے لئے یہ فرق رکھا گیا ہے کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی مشیت مطلقہ پر نہیں بل کہ اس کی رضا پر عمل کی پابند ہے اور اس کی رضا شریعت کی پابندی میں مضمر ہے۔ کوئی شخص لوگوں کو گم راہ کرنے کی مہم چلائے کہ اللہ بھی تو لوگوں کو گم راہ کرتا ہے، تو ایسا شخص خود گم راہ اور جھوٹا ہے۔ وہ اگر مخصوص لوگوں پر لعنت کرے جن کا کفر پر مرنا یقینی اور قطعی ذرائع سے ہمیں معلوم نہ ہو سکے اور وہ بہانہ یہ کرے کہ اللہ بھی تو کچھ لوگوں پر لعنت کرتا ہے تو ایسا شخص مفسد اور گم راہ ہے۔ الغرض کسی عام شخص کو بھی شریعت کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں چہ جائے کہ خود ساختہ اور مفروضہ عقائد کی مدافعت میں سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خلاف شریعت کام منسوب کر دیئے جائیں۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

بحث اختیار کلی تحقیق جدلی کی روشنی میں: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو نہ تو مجبور محض بنایا ہے کہ اسے کسی

طرح کا کچھ بھی اختیار نہ ہو اور نہ ہی اسے مختارِ مطلق یا مختارِ کل بنایا ہے کہ اسے ہر وقت ہر طرح کا اختیار حاصل ہو کہ وہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ دیکھئے ہم کھڑے ہونے کی حالت میں ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری پر کھڑے ہو سکتے ہیں یہ ہمارا اختیار ہے جو اللہ نے ہمیں دے رکھا ہے لیکن دونوں ٹانگیں اٹھا کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ چھلانگ بھی لگائیں گے تو زمین کی کششِ ثقل ہمیں نیچے آنے پر مجبور کرے گی، الّا یہ کہ ہم زمین کی اس کشش کے دائرے سے باہر نکل جائیں۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ مختارِ کل ہونا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اسی کو یہاں ثابت کیا جا رہا ہے۔

(۱) بہ حوالہ نفع وضرر: (الف) امورِ غیر عادیہ (غیر اختیاری امور) میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کو جو مفروضہ اختیارات حاصل ہوں گے یا سب اختیارات حاصل ہوں گے یا کچھ حاصل ہوں گے اور کچھ نہیں ہوں گے۔ اگر سب اختیارات انہیں حاصل ہیں یعنی وہ مختارانِ کُل یا مختارانِ مطلق ہیں تو وہ یقیناً نفع اور نقصان دونوں کے مالک ہوں گے ورنہ انہیں مختارِ کُل کہنا درست نہ ہوگا۔ اگر وہ نفع ونقصان دونوں کے مالک ہیں تو اصل نقصان وہ ہے جس کی مستقبل قریب یا بعید میں تلافی نہ ہو سکے۔ اگر تلافی ہو سکے تو وہ نقصان ہے ہی نہیں۔ عارضی تکلیف اور نقصان پر صبر کرنے والے مومنین کے نقصان کی تلافی اللہ تعالیٰ بے حد وحساب اجر دے کر کر دے گا، چناں چہ سورہ زمر میں ہے کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔ (۶۱/ الف)۔ پس اصل نقصان گم راہ ہونا اور گم راہ کرنا ہے۔ اگر کسی کی موت شرک جیسی گم راہی پر ہو جائے تو ایسے شخص کے نقصان کی تلافی ہرگز نہ ہوگی۔ پس اس نقصان یعنی گم راہی کے مقابلے میں سب سے بڑا نفع صراطِ مستقیم پر چلنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سیدھے راستے پر چلا کر کسی کو منزلِ مقصود تک پہنچا دے چناں چہ سورہ آل عمران میں ہے کہ جو شخص آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا پس وہ کام یاب ہو گیا۔ (۶۱/ ب) جب اللہ تعالیٰ نافع بھی ہے اور ضار (نقصان رساں) بھی ہے اور سب سے بڑا نفع ہدایت اور سب سے بڑا نقصان گم راہی ہے تو ہم بے دھڑک اور بلا جھجک نفع ونقصان یعنی ہدایت دینے اور گم راہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دیتے ہیں، چناں چہ مسنون خطبات مثلاً جمعہ کے خطبے میں یہ کلمات ہم اکثر سنتے رہتے ہیں **من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ ولا ھادی لہ** ''اللہ جسے ہدایت دے اسے کوئی گم راہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گم راہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا''۔ قرآن کریم میں بھی یہ مضمون بار بار بیان ہوا ہے مثلاً سورہ رعد میں ہے کہ ''اللہ جسے گم راہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ (۶۱/ ج) ہدایت وگم راہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے کر دی جاتی ہے کہ ہدایت اور گم راہی دونوں کے اسباب اسی نے پیدا فرما دئے ہیں اور ان اسباب کو موثر بھی وہی

بناتا ہے۔ اسی نے حضرات انبیا علیہم السلام کو ہدایت کے لئے بھیجا۔ ابلیس اور اس کا ساتھ دینے والے جن وانس شیاطین کو بھی اسی نے پیدا کیا اور اسی نے انہیں مہلت اور ڈھیل دے رکھی ہے۔ انبیا علیہم السلام کی طرف ہدایت کی اور شیاطین کی طرف اضلال کی نسبت بہ طور اسناد مجازی ہے۔ اب اگر اللہ کے علاوہ جن لوگوں کو مختار کل سمجھ لیا گیا ہے تو کیا ان کی طرف اضلال (گم راہ کرنے) کی نسبت کی جاسکتی ہے؟ مثلاً کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) فلاں پیغمبر فلاں صحابی اور فلاں ولی لوگوں کو گم راہ بھی کیا کرتے تھے؟ پیغمبروں کے متعلق ایسا کہنے والے تو ایمان سے ہی خارج ہو جائیں گے اور صحابہ کرامؓ یا اولیائے عظام کی طرف گم راہ کرنے کو منسوب کرنے والے فاسق وفاجر ہو جائیں گے۔ اگر ہم ایسی بات نہیں کہہ سکتے تو پھر نقصان کون پہنچاتا ہے؟ اگر ہم کہیں کہ نفع تو یہ بزرگ پہنچاتے ہیں اور نقصان اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے تو کیا یہ اللہ تعالیٰ کی صریح توہین نہیں کہ نقصان کی نسبت تو اس کی طرف کردی جائے اور نفع پہنچانے کی نسبت اس کے بندوں کی طرف کردی جائے؟ نیز اس صورت میں یہ حضرات مختارانِ کُل نہیں رہیں گے، کیوں کہ مختار کل تو نفع ونقصان دونوں کا مالک ہوتا ہے۔

(ب) جب یہ معلوم ہو چکا کہ حضرات انبیا علیہم السلام کی طرف صرف ہدایت کی نسبت کی جاسکتی ہے اور یہ نسبت بھی حقیقی نہیں بل کہ بہ طور اسناد مجازی ہے، اس لئے وہ لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے اعتبار سے ہادی بہ معنیٰ رہنما ہیں۔ کسی کو سیدھے راستے پر چلانا ان کے اختیار میں نہیں ورنہ مثلاً حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو، حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ آذرؔ کو اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پوری دنیا کو نہیں تو کم از کم اپنے اعزہ واقارب ابولہب وغیرہ کو تو ضرور ہدایت پر لے آتے۔ سورہ کہف میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو شاید ان لوگوں کے پیچھے اپنی جان اس غم سے گھلا بیٹھے کہ وہ اس بات (قرآن کریم) پر ایمان نہیں لاتے۔ (۶۲/الف) اور مثلاً سورہ شعراء میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو شاید اپنی جان کو ہی اس وجہ سے گھلا بیٹھے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ (۶۲/ب) سورہ بقرہ میں ہے کہ ''تیرے ذمے ان کی ہدایت نہیں بل کہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''۔ (۶۲/ج) سورہ نحل میں ہے کہ ''اگر تجھے ان لوگوں کی ہدایت کا حرص ہے تو بے شک اللہ جسے گم راہ کرے اسے ہدایت نہیں دیتا اور نہ کوئی ان کا مددگار ہوتا ہے''۔ (۶۳/الف) اور سورہ قصص میں ہے کہ ''تو جسے چاہے ہدایت نہیں کرسکتا بل کہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے''۔ (۶۳/ب) سورہ یونس میں ہے کہ ''کیا تو اندھوں کو ہدایت کرسکتا ہے اگرچہ وہ دیکھتے نہ ہوں''؟ (۶۳/ج) سورہ زخرف میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) کیا تو بہروں کو سنائے گا اور کیا تو اندھوں کو اور ان لوگوں کو جو صریح گم راہی میں ہیں ہدایت کرے گا''؟ (۶۴/الف) مذکورہ قرآنی مضامین سے بہ خوبی

واضح ہے کہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی اختیار میں نہیں کہ جسے چاہیں سیدھی راہ پر چلا کر منزل مقصود (جنت) تک پہنچادیں۔ چناں چہ حضرت ابوطالب کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ میں نے اسے آگ میں ڈوبا ہوا پایا فاخرجتہ الیٰ ضحضاح ''تو میں اسے پاؤں تک کی آگ میں لے آیا''۔ (۶۴/ب) یہاں آپ کا یہ فرمانا کہ میں اسے پاؤں تک کے عذاب میں لے آیا بہ طور اسناد مجازی ہے جیسے طبیب یہ کہے کہ میں نے یا فلاں دوا نے مریض کو شفایاب کیا ہے۔ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میری سفارش سے ابوطالب کے عذاب میں تخفیف ہوئی ورنہ آپ اپنے مہربان اور مشفق چچا کو سیدھا جنت میں داخل کرادیتے سورہ زمر میں ہے کہ ''بھلا جس پر (اللہ کے) عذاب کی بات پکی ہوچکی (اے پیغمبر!) کیا تو اسے جو آگ میں ہے چھڑالے گا''؟ (۶۴/ج) ظاہر ہے کہ چوں کہ کسی کو سیدھے راستے پر چلا کر جہنم سے بچالینا اور جنت میں داخل کردینا اللہ تعالیٰ ہی کا اختیار ہے اور اس نے یہ اختیار اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی یہاں تک کہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں دیا، اس لئے اس نے کفار اور منافقین کے حق میں اللہ سے استغفار کی اجازت آپ کو بھی مرحمت نہیں فرمائی۔ سورہ توبہ میں ہے کہ نبی اور مومنین کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لئے استغفار کریں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں بعد اس کے کہ یہ واضح ہوچکا کہ یہ لوگ جہنمی ہیں۔ (۶۵/الف) آپ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی تو ارشاد ہوا کہ ''(اے پیغمبر!) ان منافقین میں سے کوئی مرجائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ ہی اسکی قبر پر کھڑے ہونا''۔ (۶۵/ب) نیز ارشاد ہوا کہ ''(اے پیغمبر!) تو ان کے لئے استغفار کر یا نہ کر، اگر تو ان کے لئے ستر مرتبہ بھی استغفار کرے گا تو بھی اللہ ہرگز انہیں نہیں بخشے گا''۔ (۶۵/ج) سورہ منافقون میں بھی یہی مضمون ہے کہ ''ان (منافقین) کے حق میں برابر ہے تو ان کے لئے استغفار کرے یا نہ کرے اللہ ہرگز انہیں نہیں بخشے گا''۔ (۶۶/الف) منافقین نے مسجد ضرار بنائی۔ آپ کو پہلے سے ان کے خبیث عزائم کا علم نہیں تھا۔ ان کی درخواست پر آپ نے ان سے وعدہ فرمالیا کہ غزوہ تبوک سے واپسی پر تمہاری مسجد میں نماز پڑھادوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اس مسجد میں کبھی نہ کھڑے ہونا'' (۶۶/ب) چناں چہ آپ نے اسے منہدم کرادیا۔ مکی دور میں جب آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی اعزہ کو (کفر وشرک پر قائم رہنے کی صورت میں اللہ کے عذاب سے) ڈرایئے تو آپ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا، ''اے خاندان قریش! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے (اسلام قبول کر کے) بچالو۔ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچاسکتا۔ اے خاندان بنوعبد مناف۔ اپنی جانوں کو عذاب سے بچالو، میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچاسکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب، اے میری پھوپھی صفیہ! تم اپنے آپ کو بچالو میں

تمہیں اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔ اے میری بیٹی فاطمہ! جو مال میرے پاس ہے اس میں سے جو چاہے تو مجھ سے مانگ لے میں اللہ کے مقابلے میں تیرے کچھ کام نہیں آ سکتا۔ (۶۶/ ج) پس مختار کل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنایا ہے۔ اگر آپ کو یہ اختیار دے دیا جاتا کہ آپ لوگوں کو سیدھی راہ پر چلا کر جنت تک پہنچا دیں تو دنیا میں کوئی شخص بھی غیر مسلم نہ رہتا اور سب کے سب جنت کے مستحق ہوتے جب کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں چاہتا۔ وہ صرف رحمان ورحیم ہی نہیں، جبار وقہار بھی ہے۔ بہ شمول حضرات انبیا علیہم السلام سب کو اللہ کی مشیت پر راضی رہنے کا پابند کیا گیا ہے لیکن عمل اس کی مشیت پر نہیں، بل کہ اس کی دی ہوئی شریعت پر ہوگا۔ لوگوں کے شریعت پر عمل پیرا ہونے پر ہی وہ راضی ہے۔ یوں اللہ کی مشیت اور رضا میں واضح فرق ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا علیہم السلام اور ان کے سچے وَرَثا اہل علم کی جانب ہدایت کی نسبت اس معنی میں بہ طور اسنادِ مجازی بالکل درست ہے کہ وہ لوگوں کو منزل مقصود (جنت) تک پہنچنے کا سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ ہدایت کا معنی راستہ دکھانے کا بھی ہے۔ مثلاً سورہ شوریٰ میں ہے کہ (اے پیغمبر!) بلاشبہ تو (لوگوں کو) سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔ (۶۷/ الف) ابلیس اور شیاطین کی طرف اضلال کی نسبت بھی بہ طور اسناد مجازی ہے چناں چہ وہ اپنی مرضی سے ہر کسی کو گم راہ نہیں کر سکتے یعنی جہنم میں نہیں پہنچا سکتے وہ بھی جہنم تک پہنچنے کا صرف راستہ ہی دکھاتے ہیں۔ مثلاً سورہ نحل میں ہے کہ اس (ابلیس) کا ان لوگوں پر کوئی زور نہیں چلتا جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں (۶۷/ ب) سورہ ابراہیم میں ہے کہ ابلیس جہنم میں اپنے ساتھیوں سے کہے گا کہ میرا تم پر کوئی زور تو نہیں چلتا تھا بات تو صرف اتنی ہے کہ میں نے تم کو (گم راہی کی) دعوت دی اور تم نے (اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے نہ کہ میرے جبر سے) میری بات مان لی تو اب تم مجھے نہیں اپنے آپ کو ہی ملامت کرو۔ نہ میں تمہارا فریادرس ہوں اور نہ تم میری فریاد کو پہنچنے والے، میں تو سرے سے مانتا ہی نہیں کہ تم مجھے اس سے پہلے اللہ کا شریک مانتے رہے، یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۶۷/ ج)

(ج) جب نفع عظیم یعنی ہدایت بمعنی ایصال الی المطلوب پیغمبروں کے اختیار میں نہیں تو امور غیر عادیہ میں دیگر نفع ونقصان بھی ان کے اختیار میں نہیں، مثلاً سورہ اعراف میں ہے کہ ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میں تو اپنی جان کے لئے بھی کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے (وہی ہوتا ہے) اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی (دنیوی) بھلائیاں اکٹھی کر لیا کرتا اور مجھے کوئی (دنیوی) نقصان نہ ہوا کرتا، میں تو محض آگاہ کرنے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں''۔

(۶۸/الف) یہ قرآنی مضمون نہایت واضح ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کلی کا علم دیا گیا ہوتا تو عام اختیاری اسباب کے تحت آپ بہت سے دینوی منافع جمع کرلیا کرتے اور دنیوی نقصانات سے محفوظ رہا کرتے۔ بعض اوقات پیشگی علم کے باوجود نقصان سے بچنا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا اسی لئے آپ کی زبان مبارک سے لاستکثرت من الخیر ''میں بہت سی بھلائیاں اکٹھی کرلیا کرتا''، کہلایا گیا ہے۔ یہاں لجمعتُ الخیر ''میں سب کی سب بھلائیاں اکٹھی کرلیا کرتا'' نہیں کہلایا گیا ہے۔ حالاں کہ مختار کل کو تو ہر بھلائی جمع کرنے اور ہر نقصان سے بچنے پر پوری طرح قادر ہونا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں زخمی ہوئے۔ غزوہ احد میں آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے، چہرہ مبارک پر بھی زخم آئے۔ غزوہ خیبر میں ایک یہودی عورت نے آپ کو اور بعض دیگر صحابہ کرام کو زہر آلود کھانا کھلادیا جس سے بعض اصحاب جاں بر نہ ہوسکے اور خود آپ بھی تازیست اس زہر سے تکلیف اٹھاتے رہے اور اپنے مرض وفات میں تو آپ کو اس زہر کے اثر سے اپنی رگِ جان کٹتی محسوس ہورہی تھی (۶۸/ب)۔ سیدہ فاطمہؓ کے سوا آپ کی ساری اولاد آپ کی آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہونے والے آپ کے صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ خود آپ کی رحلت سے چند ہی ماہ پہلے آپ کی گود میں دم توڑ گئے۔ شدت غم سے آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آپ ایک مرتبہ گھوڑے سے گر گئے، چوٹ کے اثر سے آپ نے نماز بیٹھ کر پڑھی اور پڑھائی (۶۸/ج) مرض وفات میں آخری ایام میں مسجد نبوی میں جاکر نماز پڑھانے کے لئے بار بار اٹھنے کے باوجود ہر مرتبہ آپ پر غشی طاری ہوتی رہی اور بالآخر حضرت ابوبکرؓ کو امامت نماز کے لئے مقرر فرمایا۔ آپ کو دردِ شقیقہ اور بخار جیسے امراض لاحق ہوتے رہے۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آپ کو عام لوگوں کی نسبت دگنا بخار ہوتا تھا۔ (۶۹/الف)۔ کوئی شخص باختیارِ خود ہرگز بوڑھا اور کم زور نہیں ہونا چاہتا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کی ہڈیاں کم زور ہوجائیں۔ حضرت زکریاؑ نے بیٹے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو اپنے بڑھاپے کا یوں حوالہ دیا کہ اے رب! میری ہڈیاں کم زور ہوچکیں اور سر بڑھاپے کی وجہ سے (سفید بالوں سے) چمک اٹھا ہے لیکن میں کبھی بھی تجھ سے دعا کر کے محروم نہیں رہا۔ (۶۹/ب) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب ملائکہ نے حضرت اسحاق کی ولادت کی بشارت دی تو آپ نے فرمایا کہ بے شک مجھے تو بڑھاپا لاحق ہوچکا، اب تم یہ کس چیز کی بشارت دے رہے ہو؟ آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا کہ سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ عطا فرمائے۔ (۶۹/ج) ان قرآنی مضامین سے واضح ہورہا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام حتیٰ

کہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہرگز مختار کُل نہیں تھے۔ پیغمبر چوں کہ امت کے لئے نمونہ عمل ہوتا ہے اس لئے اسے مذکورہ طرز کے عوارض لاحق نہ ہوں تو وہ لوگوں کے لئے نمونہ عمل کیسے بنے گا؟ یہاں یہ تاویل لغو اور مضحکہ خیز ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام تعلیم امت کے لئے جان بوجھ کر اپنی مرضی اور اختیار سے مذکورہ عوارض اپنے اوپر مسلط فرمالیا کرتے تھے۔ وہ (معاذ اللہ) اور تصنع سے کام نہیں لیتے۔ تصنع سے کسی پر فی الواقع بڑھاپا طاری نہیں ہوا کرتا۔ کیا اپنے بڑھاپے کا حوالہ دے کر حضرت زکریاؑ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ سے تصنع فرمارہے تھے؟ اور کیا حضرت ابراہیم بھی اپنے بڑھاپے کا حوالہ دے کر فرشتوں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع سے کام لے رہے تھے؟ ایسا سوچنا تو کفر اور قرآن کریم کی کھلی تکذیب ہے۔ یہاں ذاتی اور عطائی کا بہانہ بھی نہیں چل سکتا۔ اگر مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطائی اختیار کلی بھی حاصل ہوتا تو آپ سب ہی لوگوں کو ہدایت پر لے آتے۔ آپ انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لیتے اور خود بھی دنیوی نقصانات سے محفوظ رہا کرتے۔ اگر کہا جائے کہ آپ یہ (مفروضہ) اختیار کلی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر استعمال نہیں کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آپ پابند ہوئے۔ پابندی اور اختیار کلی تو ایک دوسرے کی نقیض ہیں تو آپ کو مختار کل کہنا کیسے صحیح ہوا؟ اگر کہا جائے کہ آپ باختیار خود اس (مفروضہ) اختیار کلی کو استعمال میں نہیں لاتے تھے تو ایسے اختیار کا فائدہ ہی کیا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے (معاذ اللہ) بے مقصد یہ اختیارات آپ کو کیوں سونپ دیئے؟ بے مقصد اور عبث کام عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ جب ثابت ہو چکا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان کے نفع ونقصان کے بھی مالک نہیں تھے تو دوسروں کے لئے بھی آپ نفع ونقصان کے مالک کیسے ہو سکتے ہیں؟ چناں چہ سورہ جن میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو (لوگوں سے) کہہ دے کہ میں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ (۷۰/ الف)۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے کچھ ہی عرصے بعد حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہؓ انتقال فرما گئے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کی موت سے یہودیوں اور منافقوں کو یہ کہنے کا موقع فراہم ہوا ہے کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو اس کا ساتھی موت سے ہم کنار نہ ہوتا، حال آں کہ میں نہ تو اپنی جان کے لئے اور نہ ہی اپنے ساتھی کے لئے اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کا مالک ہوں (۷۰/ ب) دیکھئے اگر آپ عطائی طور پر بھی مختار کل ہوتے تو ضرور بالضرور حضرت اسعد بن زارہؓ کو موت سے بچا لیتے اور یہود ومنافقین کی طعنہ زنی سے محفوظ رہتے، بل کہ آپ ان یہودیوں اور منافقوں کو بھی ہدایت پر لے آتے۔

مذکورہ مباحث سے ثابت ہو گیا کہ حضرات انبیا علیہم السلام حتیٰ کہ خاتم الانبیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تکوینی اختیارات کے مالک نہیں ہیں۔ اسی طرح تشریعی اختیارات کے بھی مالک نہیں ہیں۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش تھی کہ نماز کے لئے قبلہ خانہ کعبہ ہی رہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ تھی کہ آپ کچھ عرصے کے لئے بیت المقدس کو قبلہ ٹھہرائیں۔ چناں چہ آپ اور آپ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کوئی سترہ ماہ تک اسی کو قبلہ بنائے رہے۔ آپ کو تحویل قبلہ (کہ خانہ کعبہ کو دوبارہ قبلہ مقرر کردیا جائے) کا اس قدر شوق تھا کہ آپ وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف بار بار منہ اٹھایا کرتے تھے۔ (۷۰/ج)

معراج کے موقع پر پچاس نمازیں فرض ہوئیں تو حضرت موسیٰؑ کے پراصرار مشورے پر آپ اللہ تعالیٰ سے ان کی تعداد میں بار بار کی مراجعت سے تخفیف کراتے رہے۔ آپ کی خواہش بھی یہی تھی کہ امت کے لئے تخفیف ہو۔ آپ مختار کل ہوتے تو خود ہی خانہ کعبہ کو قبلہ ٹھہرا لیتے وحی کے انتظار میں نہ رہتے۔ عالم الغیب ہوتے تو تحویل قبلہ کا ٹھیک وقت اور دن پہلے ہی سے آپ کو معلوم ہوتا اور وحی کے انتظار میں بار بار آسمان کی طرف چہرہ مبارک نہ اٹھاتے۔ آپ مختار کل ہوتے تو معراج کے موقع پر نمازوں کی تعداد میں کمی کے لئے بار بار اللہ تعالیٰ سے مراجعت نہ فرماتے، بل کہ خود ہی کمی کر لیتے۔ حضرت موسیٰؑ کا پانچ نمازوں کے متعلق بھی اصرار تھا کہ ان میں مزید کمی کرائی جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ سے بار بار درخواست کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ آپ مختار کل ہوتے تو مزید تخفیف خود ہی فرما لیتے۔ حضرت اوسؓ بن صامت نے اپنی اہلیہ حضرت خولہؓ بنت ثعلبہ سے یہ کہہ دیا کہ تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔ اسے ظہار کہا جاتا ہے۔ دور جاہلیت میں اسے طلاق سمجھا جاتا تھا۔ حضرت خولہؓ سخت پریشان ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ ظہار کے بارے میں ابھی شرعی احکام نازل نہیں ہوئے تھے اس لئے آپ نے توقف فرمایا۔ اس پر حضرت خولہؓ نے رو رو کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور آپ سے بحث شروع کردی اور یہ بھی کہا کہ اللہ ہی میرا فیصلہ فرمائے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورہ مجادلہ میں ظہار کے احکام نازل فرمائے۔ اگر آپ مختار کل ہوتے یا عالم الغیب ہوتے تو وحی کے انتظار کی ضرورت ہی کیا تھی؟ آپ اپنے (مفروضہ) اختیار کلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت خولہؓ کے حق میں فیصلہ فرما دیتے۔ سورہ نساء میں بدکار عورتوں کے متعلق ارشاد ہے کہ تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں ان پر اپنے میں سے چار گواہ طلب کرو، اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں قید رکھو۔ یہاں تک کہ موت ان کی عمریں پوری کردے یا اللہ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکالے (۱۷/ الف)۔ چناں چہ بعد میں زنا کی سزا مقرر کی گئی جس کی تفصیل سورہ نور اور احادیث صحیحہ میں موجود ہے۔ اگر آپ تشریعی اختیارات کے مالک ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

سزائے رجم اور کوڑوں کے مقرر ہونے کا انتظار ہی نہ کرنا پڑتا یا اللہ تعالیٰ ابتدا ہی سے فرما دیتا کہ میرا مختار کل رسول مناسب وقت پر اس کی سزا از خود مقرر کر دے گا۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو وہ بار بار آپ سے مطالبہ کرتے رہے کہ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ گائے کس طرح کی اور کس رنگ کی ہو حضرت موسیٰ ان کے ہر سوال کے جواب میں یہ کہتے رہے کہ اللہ یوں فرماتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو اور ایسی نہ ہو وغیرہ (۱۷/ ب)۔ حضرت موسیٰ کے ساتھی آپ کو تشریعی اختیارات کا مالک سمجھتے تو وہ یہ نہ کہتے کہ اپنے پروردگار سے پوچھ کر ہمیں بتاؤ کہ گائے کیسی ہو۔ حضرت موسیٰ تشریعی اختیارات کے مالک ہوتے تو گائے کے اوصاف خود ہی بیان فرما دیتے، اللہ تعالیٰ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

(د) جب حضرات انبیا علیہم السلام تکوینی اور تشریعی اختیارات کے مالک نہیں ہیں تو صحابہ کرامؓ اور اولیاء کرامؒ وغیرہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ اگر اولیاء کو تشریعی اختیارات حاصل ہیں تو کیا مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ روزے رمضان کی بہ جائے شعبان میں کر دیں۔ حج ذی الحجہ کی بہ جائے ربیع الاول میں کر دیں۔ زکوٰۃ کی شرح اور نمازوں کی رکعات کی تعداد میں کمی بیشی کر دیں وغیرہ؟ اگر نہیں تو اختیار کلی کی نفی ہو گئی۔ اگر وہ ایسا کر سکتے ہیں تو کیا عملاً مخلوق کو رب بنا لینا اسی کو نہیں کہتے؟ نصاریٰ کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے اپنے علما اور درویشوں کو اور مسیح بن مریم کو اللہ کے سوا رب بنا لیا۔ (۱۷/ ج) عیسائی حضرات اپنے مذہبی پیشواؤں مثلاً پوپ کو خدا کا نمائندہ قرار دیتے ہوئے انہیں تحلیل وتحریم اور جائز وناجائز ٹھہرانے کے اختیارات کا مالک سمجھتے ہیں۔ یہی ان کو رب بنانا ہے۔ ورنہ زبان سے وہ حضرت عیسیٰؑ کے سوا کسی اور کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں کہتے۔ اگر ان مفروضہ مختارانِ کل کو تکوینی اختیارات حاصل ہیں کہ وہ بارش برساتے ہوں، روزی دیتے ہوں، زندہ کرتے اور مارتے ہوں تو خود انہیں کس نے پیدا کیا؟ کس نے انہیں اس دنیا سے اٹھالیا؟ وہ تو اپنے آپ کو غسل دینے اور کفن پہنانے پر بھی قادر نہ تھے۔ لوگوں نے انہیں دفن کیا اور ان پر نماز جنازہ پڑھی۔ جب یہ بزرگ دنیا میں نہیں تھے تو کیا دنیا کی عورتیں بانجھ ہو گئی تھیں، زمین بنجر تھی، دریا اور سمندر خشک تھے، حیوانات ونباتات اور جمادات نابود تھے، اجرام فلکی مفقود تھے، لوگوں کی روزی بند تھی؟ اگر اس طرح کے کام پہلے بھی ہو رہے تھے تو کیا ان بزرگوں کے پیدا ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ معاذ اللہ تھک گیا کہ اس طرح کے کاموں (امور غیر عادیہ) کے اختیارات انہیں سونپ دیئے؟ ثابت ہوا کہ مذکورہ تمام باتیں خود ساختہ اور من گھڑت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی مختار کل ہے۔

(۲) بہ حوالہ تقسیم رزق وغیرہ: مفروضہ مختار ان کل مثلاً سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق میں صرف حلال رزق اور حلال ومباح اشیا تقسیم فرماتے ہوں گے یا حرام رزق اور حرام اشیا کی تقسیم بھی ان کے دائرہ اختیار میں ہوگی۔ اگر دوسری شق اختیار کی جائے تو کیا مثلاً شرابیوں میں شراب، افیونیوں میں افیون، چرسیوں میں چرس، جواریوں میں جوا اور جوئے کی رقم، غاصبوں، ڈاکوؤں، چوروں، جیب کتروں، رشوت خوروں وغیرہ میں حرام مال اور حرام رزق، خنزیر خوروں میں خنزیر، زانیوں میں زنا اور زانی مردوں اور عورتوں کی تقسیم وغیرہ بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) آپ فرماتے ہیں؟ کیا مثلاً برصغیر میں قیام پاکستان کے وقت مظلوم مسلمانوں کی مساجد، اراضی، جائیدادیں، اموال عورتیں اور بچے وغیرہ غیر مسلموں میں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) آپ نے تقسیم فرمائے تھے؟ چلئے حلال رزق ہی کو لیجئے۔ اسلام دشمن کفار کے گھر مال ودولت اور ہر طرح کی دنیوی آسائش کے سامان سے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) آپ نے بھر دیئے اور مسلمانوں کو ان کا دست نگر بنا دیا؟ مذکورہ غیر شرعی کام اگر ایک عام مسلمان کرے تو اس کے متعلق نہایت قبیح رائے قائم کی جائے گی، چہ جائے کہ ان کی نسبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی کی طرف کردی جائے حال آں کہ آپ تو سب سے پہلے شریعت مطہرہ کے پابند ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ پر کوئی الزام نہیں آتا۔ خالق کے کاموں کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ ہم ان مباحث کے تمہیدی مضامین میں پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ نیز اگر آپ صرف حلال رزق تقسیم فرماتے ہوں اور حرام رزق اللہ تعالیٰ تقسیم فرماتا ہو تو کیا اس سے اللہ تعالیٰ کی توہین لازم نہیں آتی؟ نیز اس صورت میں آپ کو مختار کل بھی کہنا صحیح نہ ہوگا کیوں کہ مختار کل تو مخلوق میں حلال وحرام رزق اور اشیا سب ہی کچھ تقسیم کرے گا۔

(۳) بہ حوالہ تقسیم علوم وغیرہ: (الف) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ بھی ہے اللھم انی اعوذ بك من علم لاینفع کہ ''اے اللہ! میں تجھ سے ایسی علم سے پناہ طلب کرتا ہوں جو نفع نہ دیتا ہو''۔ (۲۷/ الف) کیا آپ کی یہ دعا قبول ہوئی یا نہیں؟ اگر نہیں تو وضاحت مطلوب ہے۔ اگر قبول ہوئی تو ثابت ہوا کہ غیر نافع علوم آپ کو نہیں دیئے گئے اور آپ عالم جمیع ماکان ومایکون نہیں۔ اب اگر کوئی مثلاً زید اصرار کرے کہ آپ کو سب علوم دیئے گئے اور کوئی علم بھی غیر نافع نہیں ہوا کرتا، بل کہ بہ قول اس کے ادنیٰ شے کا علم ادنیٰ نہیں ہوتا شے ادنیٰ ہو تو ہو اس کا علم ادنیٰ نہیں ہوتا..... ہر شے کا علم نفع دینے والا ہوتا ہے، اور اگر کوئی عمرو یہ کہے ''جادو سیکھنا فرض ہے دفع جادو کے لئے'' پس سحر، کہانت، نجوم وغیرہ علوم بھی، پاکیزہ اور نافع ہیں تو جو (مفروضہ) مختار کل ساری مخلوق میں سب رزق تقسیم کرتا ہو، یقیناً وہ اس طرح کے علوم بھی تقسیم فرمائے گا۔ یوں وہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) جادو کا علم بھی ضرور تقسیم فرمائے گا۔ اگر کوئی اس کا

قائل ہے تو وہ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کا ہم نوا ہے۔ اس نے حضرت موسیٰ کے متعلق اپنے جادوگروں سے کہا تھا کہ بے شک وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم سب کو جادو سکھایا ہے۔ (۲۷/ب) جس (مفروضہ) عقیدے سے پیغمبر کے مقابلے میں فرعون کی ہم نوائی لازم آتی ہو وہ ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا۔

(ب) جو (مفروضہ) مختار کل سب مخلوق میں رزق تقسیم کرتا ہو وہ لازماً علوم بھی تقسیم کرے گا۔ چناں چہ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب مخلوق میں رزق تقسیم فرماتے ہیں تو سب میں فنون حرب اور سامان حرب وضرب یعنی جنگی اسلحہ بھی یقیناً آپ تقسیم فرماتے ہیں۔ لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ آپ نے قریش مکہ اور دیگر مشرکین عرب میں حربی علوم وفنون اور جنگی اسلحہ تقسیم فرمایا تھا۔ ان ہی جنگی آلات اور فنون حرب سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے (مثلاً) غزوہ احد میں مشرکین مکہ نے ستر کے قریب مسلمانوں کو شہید کر ڈالا جن میں آپ کے عزیز ترین چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ بھی شامل تھے، جس پر آپ کو شدید غم ہوا اور غیر اختیاری طور پر آپ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ خود اس غزوے میں آپ بھی زخمی ہوئے۔ دندانِ مبارک کا ایک حصہ شہید ہوا۔ یعنی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یہ سامان خود آپ نے ان لوگوں میں تقسیم فرما کر خود اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو سخت تکلیف باختیارِ خود پہنچائی اور پھر اس پر شدید صدمے کا اظہار بھی فرمایا۔ بعد کے ادوار اور دورِ حاضر میں بھی (مفروضہ) مختار کل کی حیثیت سے فنون حرب اور سامان حرب اپنوں اور غیروں میں آپ ہی تقسیم فرماتے ہوں گے۔ اس مفروضہ عقیدے کی رو سے غیر مسلموں کو یہ کہنے کا بھرپور حق ہے کہ مسلمانوں کا پیغمبر شریعت کا اولیں پابند ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود خود ہی ہم میں فنونِ حرب اور سامانِ حرب تقسیم فرماتا ہے پھر ہمارے ہی ہاتھوں مسلمانوں کا شدید نقصان ہونے پر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) تصنع اور بناوٹ سے کام لے کر شدید رنج وغم کا اظہار بھی فرماتا ہے، اور ادھر قرآن کریم میں کئی جگہ مثلاً سورہ توبہ میں یہ مضمون بھی موجود ہے کہ یہ رسول مومنین پر نہایت مشفق اور مہربان ہے۔ (۲۷/ج) جس (مفروضہ) عقیدے سے ایسے مضحکہ خیز نتائج برآمد ہوں وہ یقیناً من گھڑت اور خود ساختہ ہے۔ ہرگز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اس طرح کے بہ ظاہر خوش نما لیکن درحقیقت توہین آمیز عقائد کی تعلیم نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ ہی مختار کل ہے۔ اللہ تعالیٰ پر یہاں بھی کوئی الزام نہیں آتا۔ وہ جو چاہے کرتا ہے کوئی اسے پوچھ نہیں سکتا۔ وہ جو کچھ اپنے لئے چاہتا ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے، مخلوق کو دیئے گئے محدود اختیارات کے تحت مخلوق کو اس کی پیروی کی اجازت نہیں۔ مخلوق کے کرنے کے وہی کام ہیں جن پر وہ راضی ہو۔ یعنی اس کی مشیت کی نہیں بل کہ شریعت کی پیروی مخلوق کو کرنا ہوگی اور اللہ کا پیغمبر سب سے پہلے شریعت کا پابند ہوتا ہے۔ شریعت کی پیروی پر ہی اللہ تعالیٰ مکلف مخلوق جن وانس سے راضی ہوتا ہے۔

شریعت کی خلاف ورزی پر وہ ہرگز راضی نہیں۔ پس یہ ہرگز درست نہیں کہ اپنے من گھڑت اور جھوٹے عقائد کی مدافعت میں اللہ کے رسول کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر خلاف شریعت کام منسوب کر دیئے جائیں۔ فتدبر وتشکر

(ج) (مفروضہ) مختار کل کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پوری مخلوق میں رزق تقسیم فرماتے ہیں تو علوم کی تقسیم کا کام تو رزق کی تقسیم سے کہیں بالاتر ہے اور بہت سے دنیوی علوم کی بدولت رزق اور معیشت کے وسائل اور ذرائع تک رسائی آسانی سے ہوتی ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ علوم دینیہ کے علاوہ بھی آپ دنیا بھر کے علوم سب میں تقسیم فرماتے ہیں۔ آپ نے غیر مسلموں میں یہ علوم (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) نہایت ہی فیاضی سے تقسیم فرما دیئے اور دور حاضر میں ان ہی علوم کی وجہ سے وہ مسلمانوں پر غلبہ اور تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کی کسی بھی طرح کی مدد خلاف شریعت کام ہے۔ پیغمبر کا دامن اس سے پاک ہے پس مختار کل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۴) بہ حوالہ موت وحیات: مختار کل موت وحیات کا مالک ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اسے مختار کل کہنا کیسے درست ہوا؟ اگر وہ مالک ہے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ (مفروضہ) اختیار کلی کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں موت وحیات بھی تقسیم فرماتے ہیں۔ ادھر احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، آپ نے صحابہ کرامؓ کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ تمہارے اندر میرے ہوتے ہوئے تم میں سے کوئی مرجائے تو از خود اس کی نماز جنازہ پڑھنے کی بجائے مجھے اس کی موت کی اطلاع دیا کرو۔ (۳۷/ الف) اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگوں کو خود ہی مارتے تھے اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی مرجائے تو مجھے بھی بتا دیا کرو کہ وہ مرگیا ہے۔ جس (مفروضہ) عقیدے سے ایسے مضحکہ خیز نتائج برآمد ہوں جھوٹا اور من گھڑت ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر ایسے عقائد کی تعلیم لوگوں کو نہیں دیا کرتے۔

(۵) بہ حوالہ معجزات: اگر حضرات انبیا علیہم السلام اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اولیائے کرامؒ کو مختار کل قرار دیا جائے تو لازماً ہر نبی کو ہر معجزہ اور ہر ولی کو ہر کرامت دکھانے کا بھی اختیار ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اگر نہیں تو انہیں مختار کل کہنا درست نہ ہوا۔ اگر اختیار ہے تو اس شق کی بھرپور نفی قرآن کریم سے ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ مومن میں ہے کہ کسی رسول کے بس میں نہیں کہ وہ کوئی معجزہ اللہ کے حکم کے بغیر دکھا دے۔ (۳۷/ ب) سورہ انعام میں ہے کہ (اے پیغمبر!) اگر ان لوگوں کا (حق سے) منہ پھیرنا تجھے گراں گزرتا ہے تو اگر تجھ میں طاقت ہے تو پھر تو زمین میں کوئی سرنگ کھود لے یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگا لے اور انہیں کوئی نشانی (معجزہ) لاکر دکھا دے۔ (۳۷/ ج) سورہ بنی اسرائیل میں ہے کہ یہ (کفار) کہتے ہیں کہ ہم

تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کردے، یا تیرا کوئی باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا اور تو اس کے درمیان بہت سی نہریں جاری کر دکھائے، یا تو آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرادے جیسا کہ تیرا گمان ہے، یا تو خود اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ، یا تیرا کوئی گھر سونے کا ہو جائے، یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے آسمان پر چڑھنے کا اس وقت تک ہم یقین نہیں کریں گے جب تک کہ تو ہم پر ایسی کتاب نہ اتار لائے جسے ہم خود پڑھ لیں۔ (اے پیغمبر!) تو (ان لوگوں سے) کہہ دے کہ میرا رب ہر عیب سے پاک ہے (وہی قادر مطلق ہے) میں تو ایک انسان ہی ہوں جو رسول بنایا گیا ہوں۔ (۴۷/الف) سورہ انعام میں ہے کہ یہ (مشرکین) قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی (معجزہ) آئے تو وہ ضرور بالضرور اس پر ایمان لے آئیں گے (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ نشانیاں (معجزات) تو اللہ کے پاس ہیں اور تمہیں کیا خبر اگر یہ نشانیاں ظاہر کی بھی جائیں تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے (۴۷/ب) الغرض معجزہ رسول کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ عام اسباب کے تحت حضرت موسیٰ کو صرف یہی اختیار تھا کہ وہ عصا زمین پر پھینکیں تو جب اللہ چاہے تو اسے اژدھا بنادے۔ عام اسباب کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار یہی تھا کہ چاند کی طرف انگلی سے اشارہ فرمائیں لیکن اس کا دو ٹکڑے ہو جانا آپ کے اختیار سے نہیں بل کہ اللہ کے حکم سے ہوا۔ حضرت سلیمان کے ایک درباری مومن کے اختیار میں عام اسباب کے تحت یہی تھا کہ وہ اسم اعظم پڑھے ملکہ بلقیس کے تخت کو لے آنا اس کے اختیار سے نہیں بل کہ اللہ کے حکم سے تھا۔ اس نے اسے اسنادِ مجازی کے طور پر اپنی طرف منسوب کرلیا۔ اس سے دھوکہ کھانے اور لوگوں کو دھوکہ دینے کی گنجائش نہیں نکلتی ورنہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تو دلی خواہش تھی کہ مخالفین کو منہ مانگے معجزے دکھائے جائیں تو شاید وہ کفر چھوڑ کر اسلام قبول کرلیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام میں آپ کو تنبیہ فرمائی کہ ایسا خیال آپ دل سے نکال دیں۔ ضدی اور سرکش مشرکین کا پر اصرار مطالبہ تھا کہ اگر آپ سچے اور ہم جھوٹے ہیں تو ہم پر عذاب لے آ۔ اس پر سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے (اپنے سچے ہونے پر) دلیل ہے اور تم اسے جھٹلاتے ہو۔ جس (عذاب) کی تم جلدی کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں، اللہ کے سوا کسی اور کا حکم نہیں وہی حق کو (پیغمبروں کے ذریعے) بتلاتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔ تو کہہ دے کہ اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کا تم تقاضا کر رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور ظالموں کو اللہ خوب جانتا ہے''۔ (۴۷/ج) پیغمبر گو مستجاب الدعوات ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ غزوہ احد میں رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے سردارانِ قریش کے خلاف بددعا فرمائی تو ارشاد ہوا کہ آپ کے اختیار میں کچھ نہیں اور آپ کو بددعا سے منع فرمادیا گیا۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ چاہے تو پیغمبر کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر فرماتا ہے۔ مثلاً غزوہ احد میں حضرت قتادہؓ بن نعمان کی آنکھ باہر ڈھلک پڑی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اگر تو چاہے ردد تھا و دعوتُ اللّٰہ میں اسے اس کی جگہ پر لوٹا دوں اور (اس مقصد کے لئے) اللہ سے دعا کروں۔ ان کی خواہش پر آپ نے آنکھ بہ طور معجزہ واپس اپنی جگہ پر لوٹا دی۔ (۷۴/ د) پس معجزات سے پیغمبر کو اور کرامات سے کسی ولی کو مختارِ کل سمجھ لینا ہرگز درست نہیں۔

(۶) بہ حوالہ اجابتِ دعا: کیا یہ ضروری ہے کہ پیغمبر کی ہر ہر دعا کا مطلوبہ اثر بھی ظاہر ہوا کرے یا ضروری نہیں ہے؟ یہاں دوسری شق ہی درست ہے۔ حضرات انبیا علیہم السلام بلاشبہ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی عزیز ترین خواہش بھی اللہ تعالیٰ پوری نہیں فرماتے تاکہ لوگ انہیں مختارِ کل نہ سمجھ بیٹھیں، مثلاً حضرت نوحؑ کی اپنے بیٹے کے حق میں، حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی اپنے باپ کے حق میں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت ابوطالب اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے حق میں دعا کارگر نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے وہ چاہے تو کبھی ابلیس کی دعا کو بھی فوراً قبول کرلے۔ ابلیس کی قیامت تک ڈھیل دیئے جانے اور زندہ رہنے کی دعا اللہ تعالیٰ نے فوراً قبول کرلی اور فرمایا کہ جا تجھے (قیامت تک) مہلت دی گئی ہے۔ (۷۵/ الف)۔ دعا چوں کہ عبادت کا مغز ہے لہٰذا اس معنی میں حضرات انبیا علیہم السلام تو کیا، عام مسلمانوں کی بھی کوئی دعا رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کا مطلوبہ ظاہر ہو یا نہ ہو، اللہ سے دعا مانگنے کا اجر ضرور حاصل ہوگا۔ قرآن کریم میں ہے کہ تمہارے پروردگار کا فرمان ہو چکا کہ تم مجھ سے دعا کیا کرو میں اسے قبول کروں گا (کہ اس کا اجر ضائع نہیں کروں گا خواہ کسی حکمت و مصلحت کی بنا پر اس کا مطلوبہ اثر ظاہر نہ ہو)۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ عن قریب جہنم میں داخل ہوکر رہیں گے۔ (۷۵/ ب) البتہ خلاف شریعت امور میں دعا معصیت ہے، عبادت نہیں۔ پیغمبروں کے مستجاب الدعوات ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مختارِ کل ہیں ورنہ ان کی ہر ہر خواہش اور ہر ہر دعا لازماً پوری ہوا کرتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستجاب الدعوات اور مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کو ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یوں ظاہر فرمایا مااُریٰ بك الا یُسارع فی هواك (۷۵/ ج)۔ ''میں تو یہ خیال کرتی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش پوری کرنے میں جلدی کرتا ہے''۔ اس طرح کی روایات سے آپ کو یا کسی کو بھی مختارِ کل ثابت کرنا قطعاً غلط ہے۔

(۷) بہ حوالہ قضا و قدر: لوگوں کی تقدیر حضرات انبیا علیہم السلام کے اختیار میں ہوتی ہے یا نہیں

ہوتی۔ یہاں دوسری شق ہی درست ہے اور پہلی شق کی بھرپور نفی قرآن وسنت سے ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ فرقان میں ہے کہ مُلک اور حکومت میں اس (اللہ) کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا فقدرہ تقدیرا، ''تو ہر چیز کو اسی نے مقدر کیا''۔ (۷۶/الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیر لکھ دی تھی''۔ (۷۶/ب) ایمان مفصل کے کلمات میں مسلمان یہ ظاہر کرتا ہے کہ تقدیر اچھی ہو یا بری، اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ رسول کی طرف سے ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی مختارِ کُل ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام اور نیک لوگوں کی برکت اور دعا سے اللہ تعالیٰ چاہے تو تقدیرِ معلق (شرائط کے ساتھ مخصوص تقدیر) کو جس کے لئے چاہے بدل دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے نہیں بدلتا۔ یعنی تقدیر کا معاملہ مخلوق کے ہاتھ میں نہیں۔ اللہ ہی مختارِ کل ہے۔

(۸) بہ حوالہ شفاعتِ کبریٰ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعتِ کبریٰ کا منصب جلیلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے یا نہیں۔ یہاں بالاتفاق پہلی شق ہی درست ہے۔ آپ بعد از خدا بزرگ توئی کے مصداق اور شفاعتِ کبریٰ کے بلند ترین منصب پر یقیناً فائز ہیں۔ قیامت کے دن سفارش کی اجازت سب سے پہلے آپ کو ہی دی جائے گی۔ جو شفیع ہوتا ہے وہ مختارِ کُل نہیں ہوا کرتا ورنہ وہ لوگوں کے مقاصد خود ہی پورا کرنے پر قادرِ مطلق ہوگا۔ چناں چہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں غلو کرتے ہوئے یہی غلط عقیدہ اپنا رکھا ہے۔ مثلاً انجیل یوحنا میں ہے، ''بیٹا باپ سے محبت رکھتا ہے اور اس نے سب چیزیں اس کے ہاتھ میں دے دی ہیں'' اور اسی انجیل میں ہے'' کیوں کہ باپ کسی کی عدالت نہیں کرتا بل کہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیا ہے''۔ (۷۶/د) یاد رہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا اور خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ الغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کبریٰ کے منصب پر فائز ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ہرگز اس کا پابند نہیں ہے کہ آپ کو ہر کسی کے لئے سفارش کی اجازت دے۔ چناں چہ آپ کا ارشاد ہے کہ میں (اللہ تعالیٰ سے) عرض کروں گا کہ اے میرے رب! مجھے ان لوگوں کے لئے سفارش کی اجازت دے جنہوں نے لآالہ الاّ اللہ کہا ہو۔ اللہ فرمائے گا لیس لك ذالك یہ کام تیرے لئے نہیں ہے۔ لیکن مجھے اپنی عزت، جلال، کبریائی اور عظمت کی قسم ہے میں جہنم سے ایسے لوگوں کو ضرور نکالوں گا جنہوں نے یہ کلمہ پڑھا ہے۔ (۷۷/الف) پس مختارِ کل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

(۹) بہ حوالہ مرتب ومدارج: (مفروضہ) مختارانِ کل مراتب ومدارج کے لحاظ سے چھوٹے بڑے ہوں گے یا برابر برابر ہوں گے۔ اگر چھوٹے بڑے ہوں گے تو چھوٹا ہونا تو مختارِ کل کے لئے عیب

ہے، وہ اپنے اس عیب کا ازالہ کیوں نہیں کرتے؟ اگر نہیں کر سکتے تو عاجز و بے بس ہوئے۔ عاجزی اور اختیار دونوں ایک دوسرے کی ضد میں تو انہیں مختار کل کہنا کیسے درست ہوا؟ اگر وہ مراتب و مدارج کے لحاظ سے برابر درجے کے ہیں تو برابری بھی مختار کل کے لئے عیب ہے۔ وہ اس عیب کو دور کیوں نہیں کرتے؟ اگر نہیں کر سکتے تو عاجز ہوئے نہ کہ مختارِ کُل۔ مختار کل صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کا کوئی ہم سر نہیں اور وہ سب سے بڑا ہے۔

(۱۰) بہ حوالہ پابندی شریعت: یہ (مفروضہ) مختارانِ کُل اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے پابند ہیں یا نہیں ہیں۔ اگر پابند نہیں تو (معاذ اللہ) وہ اللہ تعالیٰ کے باغی ہوئے۔ اللہ کا باغی اللہ کا پیغمبر، ولی اور دوست کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ وہ مستجاب الدعوات اور بابرکت ہیں۔ ان کے توسط سے اللہ چاہے تو لوگوں کو اللہ کا فیض حاصل ہوتا ہے تو یہ درست ہے لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ مختار کل ہیں؟ پیغمبر تو شریعت کا اولیں پابند ہوتا ہے جیسا کہ اوپر مباحث میں بارہا ذکور ہو چکا ہے۔ پابندی اور اختیار کلی تو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ہی مختار کُل ہے۔

(۱۱) بہ حوالہ استفادۂ اختیار: یہ (مفروضہ) مختارانِ کُل اپنے اختیارات کو استعمال کرنے میں آزاد ہیں یا نہیں؟ اگر آزاد ہیں تو خود انہوں نے اپنی تکالیف کیوں نہ دور کیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں زخمی ہوئے، غزوہ احد میں بھی آپ کو زخم آئے۔ حضرت عمر فاروق، عثمان غنی اور علی المرتضیٰؓ شہید ہوئے۔ حضرت حسینؓ نے کربلا میں تکلیف اٹھائی اور شہید ہوئے۔ اگر یہ حضرات ان مفروضہ اختیارات کو اللہ کی مرضی کے تابع رکھنے کے پابند ہیں تو ان اختیارات کا فائدہ ہی کیا ہوا؟ جب سب امور میں اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی چلتی ہے تو صرف اور صرف وہی مختارِ کُل ہے۔

قدرت و اختیار کے باوجود اپنے آپ کو اور دوسروں کو ہلاکت میں ڈالنا شہادت نہیں، بل کہ خودکشی ہے۔ اسی طرح اپنے آپ کو اور دوسروں کو حتی الامکان نقصان سے نہ بچانا صبر نہیں، بل کہ بدترین معصیت اور نافرمانی ہے۔ لہٰذا یہاں یہ تاویل باطل ہے کہ متقی لوگوں کو ممنوعہ کاموں میں اپنا اختیار استعمال نہ کرنے پر ثواب ملتا ہے، دیکھئے کہ اگر وہ اپنے اختیار کو ممنوعہ کاموں میں استعمال کریں تو عذاب کا بھی تو اندیشہ ہے نیز باختیار خود جان کی حفاظت اور نقصان سے بچنا ممنوعہ کام نہیں یہ تو شرعاً مامور و مطلوب ہے نیز جس اختیار کے استعمال کو مشروط اور محدود کر دیا گیا ہو اسے اختیار کلی قرار دینا صریحاً غلط ہے۔ پس مخلوق نہ مجبور محض ہے کہ ایسے کسی طرح کا بھی اختیار نہ ہو اور نہ ہی مختارِ کل ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرے۔ مرضی اللہ کی چلتی ہے اور مخلوق اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع رکھنے کی پابند ہے، آزاد نہیں کہ پابند رکھے یا نہ

رکھے۔ جو اپنی مرضی میں آزاد نہیں اسے مختارِ کل کہنا ہرگز درست نہیں بل کہ سراسر خلافِ عقل ہے۔ عبد (بندہ) کا معنیٰ ہی ''باندھا ہوا، پابند'' ہے۔ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے واحد اور لاشریک ہونے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہونے کی گواہی بھی دیں۔ بندے کو مختارِ کل کہنا لفظ ''بندہ'' کی تکذیب ہے۔

(۱۲) بہ حوالہ قضائے حوائج: اگر یہ (مفروضہ) مختارانِ کُل چھوٹے بڑے ہیں تو حوائج کس سے طلب کی جائیں؟ اگر کسی چھوٹے کو پکارا جائے تو بڑے کے ناراض ہونے کا احتمال موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا اور غیور ہے۔ دوسروں کو پکارنے اور دوسروں کو مختارِ کُل قرار دینے سے وہ یقیناً ناراض ہوگا چناں چہ قیامت کے دن وہ مشرکین کو عذاب دینے پر اپنی صفتِ کبریائی کا حوالہ دے گا۔ سورۂ مومن میں ہے (مشرکین سے کہا جائے گا) یہ سزا تمہیں اس لئے دی جارہی ہے کہ جب اکیلے اللہ کو پکارا جاتا تھا تو تم نہیں مانتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے تو حکم (اور اختیار) تو اللہ ہی کا ہے جو بلند (اور) بڑا ہے۔ (۷۷/ب) اگر اللہ تعالیٰ نے سب اختیارات ان (مفروضہ) مختارانِ کُل کے حوالے کر دیئے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو پکارنے اور حاجات میں اس سے مدد طلب کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی یا نہیں؟ اگر باقی رہ گئی ہے تو ان مختارانِ کُل کا کیا فائدہ ہے؟ اگر ضرورت باقی نہیں رہی تو قرآن کریم کی اس طرح کے مفہوم کی تمام آیات (معاذ اللہ) بیکار ہوگئیں کہ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اگر حضرات انبیا علیہم السلام کو تمام اختیارات سونپ دیئے گئے ہوں تو وہ اپنی حاجتوں میں اللہ تعالیٰ کو کیوں پکارتے رہے؟ اور کبھی کبھار ایسی صورت بھی کیوں پیدا ہوئی کہ ان حضرات کی اپنی خواہشات پوری نہ ہوئیں اور دعائیں کارگر نہ ہوئیں جیسا کہ قبل ازیں اور پر نمبر شمار ۶ کے تحت مذکور ہو چکا ہے۔

(۱۳) بہ حوالہ مداخلت وعدم مداخلت: کیا مختارِ کل کے کام میں کوئی مداخلت اور روک ٹوک کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو یہی بات درست ہے اگر کرسکتا ہے تو اسے مختارِ کُل کہنا عقلِ سلیم کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے قیدیوں کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مشورے سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا اور آپ کی مرضی بھی یہی تھی۔ حضرت عمرؓ کا مشورہ تھا کہ انہیں قتل کیا جائے لیکن ان کے مشورے پر آپ نے عمل نہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ نازل ہوئی کہ اگر اللہ کی طرف سے یہ بات لکھی نہ جا چکی ہوتی (کہ اجتہادی خطا معاف ہے) تو جو تم نے (قیدیوں سے) فدیہ لے لیا (اور انہیں چھوڑ دیا ہے) اس پر کوئی تمہیں بڑی سزا ہوتی۔ (۷۷/ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے مرنے پر اس کی نماز جنازہ پڑھانا چاہتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے مداخلت کرتے ہوئے

مشورہ دیا کہ اس کا جنازہ نہ پڑھایا جائے لیکن آپ نے اس کے مخلص بیٹے کی دل جوئی کے لئے پڑھا دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ آئندہ کسی منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھنا اور نہ ہی اس کی قبر پر کبھی کھڑے ہونا (۷۸/ الف)۔ غزوہ احد میں ستر کے قریب مسلمان شہید ہوئے آپ کو شدید صدمہ ہوا۔ آپ نے بعض سردارانِ قریش کے خلاف بددعا کرنا چاہی تو ارشاد ہوا تیرا کوئی اختیار نہیں، اللہ یا تو ان پر رحمت سے توجہ فرمائے گا یا انہیں عذاب دے گا، بے شک وہ ظلم کر رہے ہیں (۷۸/ ب)۔ مکی دور میں آپ کے پاس چند غریب اصحاب بیٹھے ہوئے تھے کہ مشرکین کے چند سرداروں نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ اگر انہیں اپنی مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کے پاس آکر آپ کی باتیں سن لیں گے۔ آپ کا خیال ہوا کہ شاید اس طرح ان مشرکین کی میری باتیں سن کر اصلاح ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نہ نکال جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ ان کا کوئی حساب تیرے ذمے نہیں اور تیرا کوئی حساب ان کے ذمہ نہیں (ایسا نہ ہو کہ) تو انہیں نکال دے ورنہ تو ظالموں میں سے ہو جائے گا (۷۸/ ج)۔ آپ ایک مرتبہ اعیانِ قریش سے محوِ گفتگو تھے کہ اسی اثنا میں آپ کے پاس ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم نے وہاں آکر آپ سے دین کی باتیں پوچھنا شروع کر دیں۔ آپ کو ان کی یہ مداخلت پسند نہ آئی اور ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ اس پر سورہ عبس کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی کہ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر منافقین جھوٹے بہانے کر کے جنگ میں شامل نہ ہونے کی آپ سے رخصت طلب کرتے رہے اور آپ ان کی باتوں کا اعتبار کر کے انہیں رخصت دیتے رہے تو سورہ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تجھے معاف کرے تو نے انہیں اجازت ہی کیوں دی یہاں تک کہ آپ پر سچے لوگ بھی کھل جاتے اور تو منافقوں کو بھی جان لیتا۔ (۷۹/ الف) قریش مکہ کا آپ سے مطالبہ تھا کہ اگر آپ قرآنی مضامین میں ہماری خواہش کے مطابق کچھ تبدیلی کر دیں یا کوئی دوسرا قرآن لے آئیں تو ہم آپ کی دعوت قبول کر لیں گے۔ اس پر وحی نازل ہوئی کہ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی تبدیلی کروں، میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ (۷۹/ ب) اس طرح کی تمام مثالیں خوب واضح کر رہی ہیں کہ آپ مختارِ کل نہیں تھے۔ مختارِ کل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مختارِ کل کسی سے مشورہ نہیں لیا کرتا اور نہ ہی اسے از خود مشورہ دینے کی کوئی جسارت کر سکتا ہے۔ اس سے تو اپنی تکلیف کی شکایت اور تکلیف کے ازالے کی درخواست ہی کی جا سکتی ہے۔

(۱۴) بہ حوالہ عدم قضائے حوائج: بارہا یہ مذکور ہو چکا ہے کہ پیغمبر شریعت کا سب سے پہلے اور

سب سے زیادہ پابند ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے لئے نمونہ عمل ہوتا ہے۔ وہ اپنی امت پر مشفق ومہربان ہوتا ہے۔ ادھر شریعت مطہرہ کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان تو کیا کوئی کافر بھی کسی مصیبت اور تکلیف میں مبتلا ہو اور اس مصیبت کے دور کرنے کا اختیار تمہیں حاصل ہو تو اسے بروئے کار لاتے ہوئے مصیبت زدہ کی مدد کی جائے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختارِ کُل ہیں تو کفار کے خلاف مسلمانوں کی باختیارِ خود مدد کیوں نہیں فرماتے؟ کشمیر، فلسطین، افغانستان وغیرہ کے مسائل میں کفار کو مغلوب اور مسلمانوں کو غالب کیوں نہیں کرتے؟ اور نہیں تو حرمین شریفین پر اور خود روضہ مبارکہ پر ان لوگوں کو قابض کیوں نہیں فرماتے جو بہ زعم خویش آپ سے باقی مسلمانوں کی نسبت زیادہ محبت رکھتے ہیں؟ کیا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) آپ شریعت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے، پیغمبر اس کی مشیت میں دخل اندازی نہیں کرتے تو یہی بات ہم کہتے ہیں کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کی مشیت پر نہیں، بل کہ صرف اور صرف شریعت پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ جو پابند ہو اسے مختارِ کُل نہیں کہا جاتا۔ مختارِ کُل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ شریعت کا پابند نہیں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضا کے ایک ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رسول شریعت کی خلاف ورزی بھی کیا کرتا ہے بل کہ وہ اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ڈھالنے اور اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع رکھنے کا پابند ہوتا ہے، یوں اللہ اور اس کے رسول کی مرضی ایک ہی ہوتی ہے۔

(۱۵) بہ حوالہ اختیارِ جزئی بہ مقابلہ اختیارِ کُلی: اگر یہ (مفروضہ) مختاران سارے اختیارات کے مالک نہیں بل کہ مختارانِ بعض ہیں کہ کچھ اختیارات کے وہ مالک ہیں اور کچھ کے نہیں تو کس بزرگ کے پاس کون سا اختیار ہے اور کون سا نہیں، اس کی کوئی قطعی یقینی اور حتمی فہرست موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو ممکن ہے کہ ہم کسی بزرگ کو مثلاً بارش کے لئے پکاریں وہ صرف آندھی چلانے کا مختار ہو۔ ہم کسی کو بیٹے کے لئے پکاریں اور وہ صرف بیٹیاں دینے کا مجاز ہو۔ اگر کوئی ایسی حتمی فہرست موجود ہے تو چشمِ ما روشن دل ما شاد۔ اسے لوگوں کے سامنے لایا جائے۔

(۱۶) بہ حوالہ اسنادِ مجازی: (الف) رزق کی تقسیم اللہ تعالیٰ کرتا ہے مثلاً سورہ زخرف میں ہے کہ ہم نے ان کے درمیان ان کی روزی دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دی ہے۔ (۷۹/ ج) اور مثلاً سورہ رعد میں ہے کہ اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں فراخی کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کر دیتا ہے۔ (۸۰/ الف) لیکن اسی قرآن کریم میں تقسیم کی نسبت مخلوق کی طرف بھی کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ نساء میں ہے کہ جب (مالِ وراثت کی) تقسیم کے وقت قرابت دار، مسکین اور یتیم آجائیں تو تم اس میں سے انہیں بھی

کچھ دے دو اور ان سے نرمی سے بات کرو۔ (۸۰/ ب) وراثت کے اموال اور نقدی کی تقسیم میت کے ورثا اور لواحقین کرتے ہیں۔ ان کی طرف تقسیم مال کی یہ نسبت عام لسانی محاورات کے مطابق بہ طور اسناد مجازی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فعل اپنی شان اور اپنی قدرت مطلقہ اور اپنے علم کامل کے مطابق ہوتا ہے۔ مخلوق کی طرف اسی فعل کی نسبت بہ طور اسناد مجازی ہوتی ہے اور مخلوق کا فعل اپنی محدود صلاحیت، محدود علم، محدود قدرت، محدود اختیار کے مطابق عام اختیاری اسباب کے تحت (ماتحت الاسباب) ہوتا ہے۔ اس سے مخلوق کو (معاذ اللہ) مختار کل سمجھ لینا سنگین فکری لغزش ہے ورنہ مذکورہ بالا مثال کی رو سے مال وراثت تقسیم کرنے والوں کو بھی مختار کل کہنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ دیتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں۔ (۸۰/ ج) محدثین حضرات نے یہ حدیث باب العلم اور باب الغنیمۃ میں لاکر ظاہر کر دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں علوم دینیہ اور اموال غنیمت کی تقسیم عام اختیاری اسباب کے تحت فرمایا کرتے تھے۔ جس طرح اختیاری اسباب کے تحت مال وراثت تقسیم کرنے والے مختار کل نہیں ہو گئے اسی طرح آپ بھی مختار کل نہیں ہیں۔ سورہ انعام میں ہے کہ (اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب جانتا ہوں اور نہ ہی میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ (۸۱/ الف) غزوہ تبوک کے موقع پر سامان جنگ کی فراہمی میں بڑی تنگی تھی۔ کچھ مخلص اصحاب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا لا اجد ما احملکم علیہ (۸۱/ ب) میں تمہاری سواری کے لئے (اپنے پاس) کچھ نہیں پاتا۔ ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک سائل آیا تو آپ نے فرمایا لا اجد ما اعطیک کہ تجھے دینے کے لئے میرے پاس (اس وقت) کچھ بھی نہیں۔ وہ شخص مطمئن نہ ہوا اور کہنے لگا کہ آپ جسے چاہیں دے دیتے ہیں اور مجھے کچھ نہیں دے رہے اس پر آپ نے فرمایا یغضب علی ان لا اجد ما اعطیہ (۸۱/ ج) یعنی یہ مجھ پر ناراض ہو رہا ہے کہ اسے دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ جو مختار کل ہو وہ نہ صرف ہر چیز کا مالک ہوگا، بل کہ اختیار کلی کے تحت ہر چیز اس کی دست رس میں بھی ہوگی لہٰذا یہاں یہ تاویل نہایت ہی لچر اور مضحکہ خیز ہے کہ مال ہونا اور بات ہے اور کسی چیز کو اپنے پاس نہ پانا اور بات ہے، نیز یہاں ذاتی اور عطائی کی تاویل بھی نہیں چل سکتی اور سورہ انعام کے مذکورہ مضمون میں بھی یہ تاویل نہیں چل سکتی، کیوں کہ اس میں یہ بھی ہے کہ تو کہہ دے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ اگر یہاں ذاتی کی نفی مراد ہے اور عطائی کی نہیں تو لازماً آپ کو فرشتہ بھی قرار دینا ہوگا۔ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو عزت واحترام کا سجدہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سید الانبیاء اور حضرت آدمؑ سے افضل ہیں لہٰذا فرشتوں سے آپ کا افضل ہونا اظہر من الشمس ہے۔ اب اگر ذاتی اور

عطائی کی آڑ میں آپ کو فرشتہ قرار دیا جائے کہ یہاں فرشتہ نہ ہونے کی نفی ذاتی ہے، عطائی نہیں یعنی میں خود بہ خود فرشتہ نہیں بن گیا بل کہ اللہ نے مجھے بنایا ہے، تو خود سوچئے اس سے آپ کی کس قدر توہین لازم آتی ہے! پس ان باتوں میں بھی کہ میرے پاس اللہ کے خزانے نہیں ہیں اور میں غیب نہیں جانتا، لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں بھی عطائی خزانوں اور عطائی غیب ہی کی نفی مراد ہے۔ نبی اور رسول کے الفاظ ہم معنی بھی استعمال ہوتے ہیں اور کبھی ان میں لطیف فرق بھی کیا جاتا ہے۔ اس فرق کے اعتبار سے حضرت نوحؑ کو سب سے پہلا رسول قرار دیا جاتا ہے۔ سورہ انعام میں جس بات کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کرایا گیا ہے ہو بہو اسی طرح کا اعلان بہ مطابق سورہ ہود حضرت نوحؑ سے بھی کرایا گیا ہے کہ ''تو (لوگوں سے) کہہ دے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں غیب نہیں جانتا اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں'' (۸۲/ الف) جب سب سے پہلے رسول حضرت نوحؑ اور سب سے آخری رسول خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب، مختار کُل اور فرشتہ نہیں بل کہ انسانِ کامل ہیں تو درمیان والے رسول اور نبی کیوں کر مذکورہ اوصاف کے حامل ہو سکتے ہیں؟ صحیحین وغیرہ میں ایک حدیث کے الفاظ ہیں اُعطیتُ خزائن الارض (۸۲/ ب) یعنی مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے ہیں۔ آپ نے خود ہی اس حدیث کا مطلب سمجھا دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کے مشرق اور مغرب کو لپیٹا اور مجھے دو سرخ اور سفید خزانے عطا فرمائے اور بے شک میری امت ان تک جا پہنچے گی۔ (۸۲/ ج) زمین کے خزانوں والی حدیث کا مطلب امام نوویؒ شارح مسلم نے یہ بیان کیا ہے ان امته تملك خزائن الارض وقد وقع ذالك (۸۳/ الف) کہ بے شک آپ کی امت زمین کے خزانوں کی مالک ہوگی اور بے شک اسی طرح ہوا''۔ ان احادیث میں روم وایران کی حکومتوں کے مغلوب ہونے اور ان کے خزانوں کے مسلمانوں کے ہاتھ لگنے کی طرف اشارہ ہے، چناں چہ خلفائے راشدینؓ کے دور میں ایسا ہی ہوا پیغمبر کی خصوصیات سے امت بھی مستفید ہو سکتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پوری زمین میرے لئے مسجد بنائی گئی ہے۔ اس خصوصیت سے امت بھی فائدہ اٹھا رہی ہے کہ جہاں بھی نماز پڑھ لو ادا ہو جائے گی اسی طرح زمین کے خزانے عطا ہونا اگر چہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے لیکن اس سے خلفائے راشدینؓ کی خصوصاً اور امت مسلمہ کی عموماً فتوحات مراد ہیں۔

بعض اوقات حدیث کے جملہ متون کو یک جا کرنے اور ان کا تقابل کرنے سے بھی مفہوم واضح ہو جاتا ہے مثلاً صحیح مسلم میں حضرت ربیعہؓ بن کعب سے مروی ہے کہ میں ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں رہا۔ وضو کا پانی اور ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کیں تو آپ نے (خوش ہوکر) فرمایا کہ اے ربیعہ! جو تم مانگنا چاہتے ہو مانگو۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے بہ روز قیامت آپ کا ساتھ نصیب ہو۔ آپ نے فرمایا، کچھ اور بھی مانگتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ بس مجھے یہی چاہئے تو آپ نے فرمایا کہ پھر کثرت سجود (یعنی بہ کثرت نماز پڑھنے سے) میری مدد کرو۔ (۸۳/ ب) اسی روایت کا مضمون مسند امام احمد بن حنبلؒ میں بھی ہے جس کے مطابق حضرت ربیعہؓ نے آپ سے یوں درخواست کی تھی یا رسول اللہ اسئلك ان تشفع لی الیٰ ربك فیعتقنی من النار (۸۳/ ج) ''اے اللہ کے رسول! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے رب سے میری سفارش فرمائیں کہ وہ مجھے (جہنم کی) آگ سے بچائے رکھے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ربیعہؓ سے یہ فرمانا کہ جو چاہتے ہو مانگو، اس کا مطلب یہ ہے کہ عام اختیاری اسباب کے تحت (ماتحت الاسباب) میں جو کچھ کرسکتا ہوں اس کے تحت مجھ سے مانگو۔ اور آپ کا یہ فرمانا کہ کثرتِ سجود سے میری مدد کرو، اس کا مطلب بھی واضح ہے کہ تم اختیاری اسباب کے تحت نماز بہ کثرت پڑھ سکتے ہو۔ ایسا کرنے سے میں اللہ تعالیٰ سے تمہارے حق میں دعا اور سفارش کرسکوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص مجھے اپنی زبان اور شرم گاہ پر قابو پانے کی ضمانت دے تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں''۔ (۸۴/ الف) آپ نے یہ ضمانت وحی ربانی کی بنا پر دی ہے، کیوں کہ آپ مورِ وحی ہیں اور وحی کو لوگوں تک پہنچانے کے پابند ہیں اور آپ نے فی الواقع وحی کو لوگوں تک پہنچایا ہے اس لئے قرآن وسنت پر اعتماد کرتے ہوئے ایک عام مسلمان بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ جو شخص ایمان واعمال صالحہ کی دولت سے بہرہ مند اور کبائر سے بچتا ہو اور صغائر سے توبہ کرتا ہو تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ اسی طرح اگر آپ نے کبھی کبھار کسی موقع پر کسی کو شریعت کے کسی خاص حکم سے مستثنیٰ فرمایا ہو، مثلاً آپ نے حضرت خزیمہؓ بن ثابت انصاری کی شہادت کو دو مردوں کی شہادت کے برابر قرار دیا، یا مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کے لئے چھ ماہ کی بکری کی قربانی کو جائز قرار دیا وغیرہ، جتنے بھی واقعات احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں تو یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مفروضہ اختیارِ کلی کی بنا پر نہیں بل کہ وحی کی ربانی کی بنا پر ہے۔ وحی کا نزول پیغمبر پر آناً فاناً بھی ہوسکتا ہے اور وحی خفی کے نزول کا تو لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ موضوع اور ضعیف احادیث تو سرے سے خارج از بحث ہیں۔ صحیح احادیث کا بڑا ذخیرہ اخبار آحاد پر مشتمل ہے۔ خبرِ واحد کو ہمیشہ کتاب اللہ کے تابع رکھا جائے گا خصوصاً اس کا اگر قرآن کریم سے تعارض نظر آتا ہو یا کھینچا تانی سے جان بوجھ کر پیدا کیا جارہا ہو تو کتاب اللہ ہی کو لیا جائے گا کیوں کہ عقائد خبرِ واحد سے ثابت نہیں ہوتے۔ کسی خبرِ واحد کی کتاب اللہ سے مطابقت ممکن نظر نہ آئے یا

صحیح تطبیق کو بھی کوئی شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر ٹھکرائے تو کتاب اللہ ہی کو لیا جائے گا، خبر واحد کو چھوڑ دیا جائے گا۔

(ب) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض ازواج کی خاطر شہد استعمال نہ کرنے کا عزم فرمایا تو سورہ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی! جو چیز اللہ نے تیرے لئے حلال کی ہے تو اسے (اپنے اوپر) حرام کیوں کرتا ہے؟ (کیا) تو اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔ (۸۴/ب) اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام ٹھہرانے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اسے سب کے لئے حرام سمجھا جائے یہ تو کفر ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حلال کو حلال تو سمجھے لیکن کسی مصلحت یا مجبوری مثلاً مرض وغیرہ کی بنا پر اپنے استعمال میں نہ لائے۔ یہ بعض صوتوں میں مباح بھی ہے۔ سورہ تحریم کے مذکورہ مضمون سے یہ واضح ہے کہ تحلیل وتحریم کا اختیار اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی مختار کل ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار تھا کہ آپ اپنی ازواج کی دل جوئی کے لئے شہد نہ کھانے کا عزم فرمائیں یا نہیں تھا؟ اگر نہیں تھا تو آپ ﷺ مختار کل نہ ہوئے اور اگر اختیار تھا تو سورہ تحریم کیوں نازل ہوئی؟ اور کیوں آپ کے اس فعل کو یمین اور قسم سے تعبیر کر کے آپ کو کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا؟ پس یہاں کوئی تاویل کارگر نہیں ہو سکتی۔ آپ نے لوگوں کو لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا تو انہیں خیال ہوا کہ شاید لہسن حرام ہو چکا ہے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا اے لوگو! انہ لیس لي تحریم ما احل اللہ لي لکنها شجرة اکرہ ریحها (۸۴/ج) بے شک مجھے یہ اختیار نہیں کہ جو چیز اللہ نے میرے لئے حلال کی ہے میں اسے حرام ٹھہراؤں لیکن یہ (لہسن کا) پودا ایسا ہے جس کی بو کو میں پسند نہیں کرتا''۔ سورہ نمل میں مکہ مکرمہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ (اے پیغمبر! تو کہہ دے کہ) مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں جس نے اسے حرام ٹھہرایا ہے اور ہر چیز اسی کے لئے ہے۔ (۸۵الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان مکة حرمها اللہ تعالیٰ و لم یحرمه الناس (۸۵/ب) بے شک مکہ کو اللہ نے حرام (حرمت والا شہر) قرار دیا ہے لوگوں نے نہیں''۔ مدینہ منورہ کے متعلق آپ کا ارشاد ہے، حرم ما بین لابتي المدینة علیٰ لساني (۸۵/ج) یعنی مدینے کے دو سنگستانوں کے درمیان کے علاقے کی حرمت کا میری زبان سے اعلان کرایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تحلیل وتحریم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، حرمین شریفین کی حرمت بھی اسی کی طرف سے ہے۔ اب اگر کسی موقع پر تحلیل وتحریم کی نسبت رسول اللہ کی طرف کی گئی ہے تو یہ محض بطور اسناد مجازی ہے۔ مثلاً سورہ اعراف میں ہے کہ یہ نبی لوگوں کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو ان پر

حرام ٹھہراتا ہے۔(۸۶/ الف) اسی طرح کسی روایت کا یہ مضمون ہو کہ ابراہیم نے مکہ کو حرام ٹھہرایا ہے اور میں نے مدینہ کو حرام قرار دیا ہے، تو یہ بھی بہ طور اسنادِ مجازی ہے کیوں کہ اوپر مذکور ہو چکا کہ ان دونوں شہروں کو اللہ تعالیٰ نے ہی حرام ٹھہرایا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شارع حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجازاً شارع کہا جاتا ہے، کیوں کہ آپ یہ راہ راست اللہ تعالیٰ سے بہ ذریعہ وحی احکام لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کو شارع نہیں کہا جاتا کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست نہیں بل کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ احکام شریعت سے باخبر ہوتے ہیں۔ قاضیوں اور مفتیوں کو بھی مجازاً قاضی اور مفتی کہا جاتا ہے وہ کوئی دینی مسئلہ یا حکم بناتے نہیں بل کہ بتاتے ہیں۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ سورۂ اعراف مکی سورت اور سورۂ تحریم مدنی سورت ہے۔ اگر سورۂ اعراف کی متعلقہ آیت کے مذکورہ مضمون سے یہ ثابت ہوا ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تحلیل وتحریم کے اختیارات دیئے گئے ہیں تو کئی سالوں کے بعد سورۂ تحریم میں آپ سے یہ کیوں کہا جاتا کہ اے نبی! تو اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے لئے کیوں حرام کرتا ہے؟ پس سورۂ اعراف میں آپ کی طرف تحلیل وتحریم کی نسبت بہ طور اسنادِ مجازی ہے کہ آپ اللہ کی طرف سے حلال وحرام اشیا کے مظہر اور بیان کنندہ ہیں۔

(ج) مذکورہ بالا مباحث سے یہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے کسی فعل کی نسبت مخلوق کی طرف بھی کی گئی ہو تو مخلوق کی طرف یہ نسبت بہ طور اسنادِ مجازی ہوتی ہے اور اس اشتراکِ فعلی سے خالق کی صفات مخلوق میں منتقل نہیں ہو جاتیں۔ مخلوق کے باہم اشتراکِ فعلی سے بھی ان کی باہمی مساوات ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس سے زید کی صفات بکر میں منتقل ہوتی ہیں، مثلاً زید اور بکر دونوں بہ طور معلّم لوگوں کو تعلیم دیتے ہوں تو اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مثلاً زید کی ذہانت وفطانت، علم وتقویٰ، شکل وشباہت، قد وقامت، مزاج وطبیعت بکر میں منتقل ہوگئی ہے، جب مخلوق کا یہ حال ہے تو کہاں خالق اور کہاں مخلوق! ان کا اشتراکِ فعلی بھی یہ معنی نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات (معاذ اللہ) مخلوق میں منتقل ہوگئی ہیں۔ خالق کا فعل اپنی شان اور اپنی حیثیت کے مطابق اور مخلوق کا فعل اپنی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ عام لسانی محاورات کے مطابق قرآن کریم میں بھی خالق ومخلوق کے اس ظاہری اشتراکِ فعلی کی مثالیں ملتی ہیں خواہ یہ اشتراکِ فعلی کسی ایک آیت میں یک جا مذکور ہو یا متعدد آیات کے تقابل سے ظاہر ہوتا ہو، بات ایک ہی ہے کہ اس اشتراک غیر حقیقی سے مخلوق عالم الغیب، حاضر وناظر یا مختارِ کل نہیں ہو جایا کرتی۔ یہ اشتراکِ فعلی عام لسانی محاورات کے مطابق محض سہولتِ فہم کے لئے ہوتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، غنی کرتا ہے وغیرہ افعال کے لئے کوئی اور کلمات وضع کئے جاتے تو عام لوگوں کو بڑی الجھن پیش آتی۔

سورہ توبہ میں منافقین کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ (اے پیغمبر!) تو (ان منافقین سے) کہہ دے کہ تم عمل کئے جاؤ، عن قریب تمہارے اعمال کو اللہ اور اس کا رسول اور مومنین دیکھ لیں گے پھر تمہیں اس (اللہ) کے پاس لوٹایا جائے گا جو غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے پھر وہ تمہیں تمہارے عمل بتائے گا۔ (۸۶/ب) یہاں دور نبوی ﷺ کے منافقین کے عمل کو دیکھنے کے فعل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہ ظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ لیکن آخر میں فرق واضح کر دیا گیا ہے کہ عالم الغیب والشہادۃ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کا منافقین کے اعمال پر نظر رکھنا عام اختیاری اسباب کے تحت (ماتحت الاسباب) ہے۔ اس سے آپ اور آپ کے ساتھی حاضر وناظر، غیب دان اور مختار کُل نہیں ہو گئے۔ اسی سورہ توبہ میں ہے کہ یہ (منافقین) تمہارے سامنے جھوٹے عذر پیش کریں گے جب تم (غزوہ تبوک سے) واپس (مدینہ میں) ان کے پاس لوٹ کر آؤ گے۔ تو کہہ دے کہ عذر مت پیش کرو بے شک اللہ نے تمہاری خبریں ہمیں بتادی ہیں (آئندہ) کے لئے عن قریب اللہ اور اس کا رسول تمہارے اعمال کو دیکھیں گے پھر تم اس (اللہ) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے پھر وہ تمہیں تمہارے عمل بتادے گا۔ (۸۶/ج) یہاں بھی اللہ اور اس کے رسول کی ظاہری مشترکہ رویتِ اعمال میں آخر میں حسبِ سابق فرق واضح کر دیا گیا ہے۔ اور مثلاً اسی سورت میں منافقین کے متعلق ارشاد ہے کہ وہ صرف اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ انہیں اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے رسول نے غنی کر دیا (۸۷/الف) اور مثلاً اسی سورت میں ہے کہ اگر یہ (منافقین) اللہ اور اس کے رسول کے دیئے ہوئے پر راضی رہتے اور یہ کہتے کہ اللہ ہمیں کافی ہے، عن قریب اللہ اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی، ہم تو اللہ ہی کی طرف رغبت کرتے ہیں (تو ایسا کہنا بہتر ہوتا)۔ (۸۷/ب) ان مضامین میں اللہ کی طرف سے منافقین کو غنی کرنے اور دینے کے فعل میں بہ ظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شریک کیا گیا ہے، جیسا کہ قبل ازیں اوپر مضمون میں گزر چکا ہے۔ اللہ اور رسول کے فعل میں فرق واضح کرنے کے لئے یہاں متعلقہ آیت میں حسبنا اللہ (اللہ ہمیں کافی ہے) اور انا الی اللہ راغبون (ہم اللہ کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں)۔ کے کلمات لائے گئے ہیں، یہاں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کیا گیا ہے۔ اور مثلاً سورہ احزاب میں ہے کہ کسی مومن مرد اور مومن عورت کو اپنے کسی امر کا اختیار نہیں رہتا، جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے۔ (۸۷/ج) یہاں رسول کی طرف قضا (فیصلہ کرنے) کی نسبت بہ طور اسناد مجازی ہے، کیوں کہ اللہ کا فیصلہ رسول کی زبان مبارک پر ہی جاری ہوتا ہے۔ اس سے آپ مختارِ کُل نہیں ہو گئے ورنہ تمام قاضیوں کو بھی مختار کُل ٹھہرانا ہوگا۔ سورہ حشر میں ہے کہ

رسول جو تمہیں دے دے اسے لو اور جس چیز سے منع کر دے اس سے رک جاؤ۔ (۸۸/ الف) یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دینے اور منع کرنے کی جو نسبت کی گئی ہے اس سے اموال غنیمت اور احکام شریعت کا دینا مراد ہے اور شریعت نے جن کاموں سے روک دیا ہے وہ نواہی مراد ہیں۔ اس سے آپ کا مختار کُل ہونا ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ہر کسی کو ہر طرح کا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) حلال وحرام رزق، ہر طرح کے علوم، ہر طرح کے فنونِ حرب اور جنگی اسلحہ، زندگی اور موت وغیرہ دے رہے ہیں ورنہ ایسے غلط تصور سے جو بھیانک نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا تذکرہ سابقہ مباحث میں ہو چکا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس کو راضی کرتے اگر یہ لوگ سچے ایمان والے ہیں (۸۸/ ب)۔ یہاں اللہ اور رسول کے لئے ضمیر واحد اس لئے لائی گئی ہے کہ اللہ اور رسول کی رضا اس معنی میں ایک ہی ہے کہ رسول اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے عین تابع رکھتا ہے۔ ضمیر واحد لانے سے رسول کا (معاذ اللہ) خدا ہو جانا یا مختار کُل ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔

(د) قرآن کریم میں بارہا اضلال (گم راہ کرنے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے کیوں کہ ہدایت اور گم راہی کے سارے اسباب اور ذرائع اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور وہی انہیں موثر بناتا ہے۔ مثلاً سورہ ابراہیم میں ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے، گم راہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ بڑا ہی زبردست (اور) صاحبِ حکمت ہے (۸۸/ ج) اب دیکھئے اسی اضلال (گم راہ کرنے) کی نسبت اسی قرآن کریم میں مثلاً فرعون اور سامری کی طرف بھی کی گئی ہے، سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ اس (اللہ) نے کہا کہ ہم نے تیری قوم کو تیرے پیچھے آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گم راہ کر دیا (۸۹/ الف) اور اسی سورت میں ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کو گم راہ کیا اور سیدھی راہ نہ دکھائی (۸۹/ ب) اسی گم راہ کرنے کی نسبت سرکش شیاطین کی طرف بھی کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ حج میں ہے کہ یہ بات لکھ دی گئی ہے کہ جو شخص بھی اس (سرکش شیطان) سے دوستی لگائے گا تو وہ اسے گم راہ کر دے گا اور اسے جہنم کے عذاب کی طرف لے جائے گا۔ (۸۹/ ج) سورۂ مائدہ میں اسی گم راہ کرنے کی نسبت امم سابقہ کے کفار کی طرف کی گئی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے کہ تم ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے خود بھی بھٹک گئے اور بہت سے لوگوں کو بھی انہوں نے گم راہ کر دیا۔ (۹۰/ الف) اور حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو بت پرستی سے محفوظ رکھنے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو گم راہ کرنے کی نسبت بتوں کی طرف یوں کی کہ اے میرے پروردگار! انہوں نے (یعنی بتوں نے) بہت سے لوگوں کو گم راہ کیا ہے۔ (۹۰/ ب) لیجئے اگر اسنادِ مجازی اور فعلی اشتراک سے کسی کا عالم الغیب، حاضر وناظر اور مختار کُل ہونا ثابت ہوتا ہو، تو سب ہی کفار، سرکش

شیاطین جن میں شیطان اکبر ابلیس بھی شامل ہے، فرعون، سامری وغیرہ اور مشرکین کے شیطان کے ہی بت (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) عالم الغیب، حاضر و ناظر اور مختار کل ثابت ہو گئے۔ جس اسناد مجازی اور اشتراک فعلی نے حضرات انبیاء علیہم السلام اور پھر اولیائے کرام کو بزعم خویش عالم الغیب، حاضر و ناظر اور مختار کل ثابت کیا جا رہا تھا اسی انوکھے استدلال سے کفار و شیاطین اور بتوں میں بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یہی اوصاف ماننے پڑیں گے ایسا استدلال جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کفار و شیاطین اور بتوں سے ممتاز نہ کرے بلکہ برابر کی سطح پر لے آئے وہ یقیناً مردود استدلال ہے خواہ اس سے کوئی خود فریب کھاتا ہو یا دوسروں کو فریب دیتا ہو۔ اشتراک فعلی کی طرح اشتراک اسمی سے بھی دھوکہ نہیں ہونا چاہیے۔ اشتراک اسمی اور فعلی اور دیگر اہم متعلقات کی وضاحت ہم نے اعجاز القرآن کے عنوان کے تحت سورۃ فاتحہ کے مباحث میں دوسرے شبہے کے جواب میں بھی کی ہے۔ (۹۰/ ج)

حوالہ جات

۱۔ (الف) البقرہ:۲۹ (ب) الذاریات:۵۶ (ج) النساء:۶۹

۲۔ (الف) البقرہ:۲۸۶ (ب) الانعام:۱۷، ۱۵۱، الحج:۷۰، الشوریٰ:۵۲، التغابن:۵ (ج) النحل:۴۴

۳۔ (الف) النساء:۸۳ (ب) البقرہ:۲۱ (ج) الفرقان:۷۷

۴۔ (الف) حم السجدہ:۳۶ (ب) البقرہ:۲۰۸ (ج) بنی اسرائیل:۸۵

۵۔ (الف) بنی اسرائیل:۳۶ (ب) البقرہ:۴۳ (ج) المائدہ:۶۹

۶۔ (الف) النساء:۱۵۰، ۱۵۲ (ب) النساء:۱۳۶ (ج) البقرہ:۱۷۷

۷۔ (الف) البقرہ:۱۳۶۔۱۳۷ (ب) محمد:۲، ۳ (ج) البقرہ:۱۶۱

۸۔ (الف) محمد:۱ (ب) المائدہ:۳۶ (ج) آل عمران:۱۹

۹۔ (الف) آل عمران:۸۵ (ب) المائدہ:۷۲۔۷۳ (ج) المائدہ:۱۷

۱۰۔ (الف) مجلہ السیرۃ، ششماہی شمارہ ۲۳، رمضان المبارک ستمبر ۲۰۰۹ء، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز کراچی

۱۱۔ (الف) ص [illegible] (ب) المائدہ [illegible] (ج) آل عمران [illegible]

۱۲۔ (الف) الفجر [illegible] (ب) الانعام [illegible] (ج) الاعراف:۱۸۸

۱۲۔ (الف) آل عمران:۱۱۳، ۱۱۵ (ب) بنی اسرائیل:۸۵ (ج) النساء:۱۶۵

۱۳۔ (الف) الانعام:۱۴۹ (ب) البقرہ:۲۸۶ (ج) الزمر:۱۰

۱۴۔ (الف) المائدہ:۳ (ب) النساء:۱۱۵ (ج) یوسف:۴، ۶

۱۵۔ (الف) الاحزاب: ۵۶،۵۸ (ب) الانفال: ۷۴ (ج) التوبہ: ۱۱۷

۱۶۔ (الف) الحدید: ۱۰ (ب) الممتحنہ: ۷ (ج) التحریم: ۸

۱۷۔ (الف) البقرہ: ۱۴۳ (ب) التوبہ: ۷۳۔ التحریم: ۹ (ج) آل عمران: ۱۳

۱۸۔ (الف) الفتح: ۱۸ (ب) التوبہ۔ ۹۶ (ج) الاحزاب: ۴۸

۱۹۔ (الف) الدھر: ۲۴ (ب) الکہف۔ ۲۸ (ج) المائدہ: ۵۴

۲۰۔ (الف) صحیح بخاری: ج ۱، ص ۴۹۰ ☆ فتح الباری: ج ۱۱، ص ۳۸۵ (کتاب الرقاق، باب الحشر)
(ب) الانبیاء: ۱۰۱، ۱۰۳ (ج) الحشر: ۱۰

۲۱۔ (الف) آل عمران: ۱۵۹ (ب) التوبہ: ۱۰۳ (ج) محمد: ۱۹

۲۲۔ (الف) الممتحنہ: ۱۲ (ب) المومن: ۷ (ج) الشوریٰ: ۵

۲۳۔ (الف) الانعام: ۵۴ (ب) التوبہ: ۱۱۷ (ج) ایضاً: ۱۱۲

۲۴۔ (الف) التحریم: ۸ (ب) آل عمران: ۹۲ (ج) الاحزاب: ۳۳

۲۵۔ (الف) التوبہ: ۷۲ (ب) ایضاً: ۲۰، ۲۲ (ج) ایضاً

۲۶۔ (الف) ایضاً: ۱۱۷ (ب) الفتح: ۲۰ (ج) ایضاً: ۲۹

۲۷۔ (الف) آل عمران: ۱۹۵ (ب) المطففین (ج) بنی اسرائیل: ۱۰۰

۲۸۔ (الف) دیکھئے حوالہ نمبر ۱۸ (ب) محمد: ۳۰، ۲۹ (ج) التوبہ: ۱۲۴

۲۹۔ (الف) آل عمران: ۱۰۹، ۱۷۹ (ب) النور: ۲۹ (ج) التوبہ: ۷۳، التحریم: ۹

۳۰۔ (الف) الحجرات: ۹، ۱۰ (ب) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دار القاہرہ (مصر) طبع اول ۱۹۹۲ء: ج ۷، ص ۱۷۳
(ج) المصنف لابن ابی شیبہ: ج ۱۵، ص ۲۷۰، تحت کتاب الفتن ☆ طبقات ابن سعد: ج ۳، ص ۱۹۔ تحت تذکرۃ علی بن ابی طالبؓ
(د) المصنف لابن ابی شیبہ: ج ۱، ص ۱۰۱۸ (قلمی نیز جھنڈا) ☆ کتاب الجمل: ج ۵، ص ۸۲ طبع کراچی

۳۱۔ (الف) تاریخ طبری: ج ۵، ص ۴۸ (ب) البدایہ والنہایہ: ج ۷، ص ۲۴۲، ۲۴۵، ۲۵۵
(ج) ابو حنیفہ الدینوری: الاخبار الطوال۔ بیروت (طبع اول) ۲۰۰۱ء: ص ۲۸۸
(د) البدایہ والنہایہ: ج ۸، ص ۱۴۳ (ہ) تاریخ ابن عساکر، طبع دمشق: ج ۵۹، ص ۱۴۹

۳۲۔ (الف) تلخیص تاریخ ابن عساکر: ج ۴، ص ۲۲ (ب) العقیدۃ وا ... الجمل: ص ۷۸، ۲۲، ۵۵
تحت دفن القتلیٰ وتوجع العلی رضی اللہ عنہ علیہم (ج) الہیثمی: مجمع الزوائد: ج ۸، ص ۲۵۷ ☆ الذہبی۔ سیر اعلام النبلاء: ج ۳، ص ۹۵۔ تحت تذکرۃ معاویۃ بن ابی سفیانؓ ☆ کنز العمال: ج ۱، ص ۸

۳۳۔ (الف) سعید بن منصور (السنن۔ طبع مجلس علمی، کراچی) ج ۳، ص ۳۷۴، روایت رقم ۲۹۶۸ مذکورہ بعض حوالہ جات سیرۃ المرتضیٰ مؤلفہ مولانا محمد نافع طبع تاریخ ۱۹۹۴ء ذی شان بک پیلس ۵۵ ... نگر، ملتان

روڈ۔لاہور سے ماخوذ ہیں۔ (ب) نہج البلاغہ: ج۲،ص۱۱۴ (ج) البدایۃ والنہایۃ: ج۸،ص۱۲۵

۳۴۔ (الف) الانفال:۲۵ (ب) النور:۱۲ (ج) البدایۃ والنہایۃ: ج۷،ص۲۲۱،۲۳۹۔۲۴۰

۳۵۔ (الف) ایضاً (ب) الاعراف:۱۵۱ (ج) الانبیاء:۷۸،۷۹

۳۶۔ (الف) الحجر:۴۷ (ب) الاعراف:۴۳ (ج) النساء:۹۳

۳۷۔ (الف) الاحزاب:۵۷ (ب) التحریم:۸ (ج) النساء:۱۳،۱۴

۳۸۔ (الف) البقرہ:۲۷۵ (ب) النساء:۴۸،۱۱۶ (ج) الزمر:۵۳

۳۹۔ (الف) طٰہٰ:۸۲ (ب) الفرقان:۶۸۔۶۹ (ج) المائدہ:۳۳

۴۰۔ (الف) التحریم:۹ (ب) بہ حوالہ تالیف قلب ومؤلفۃ القلوب۔ مصنفہ سید الطاف حسین گیلانی۔ پروگریسو بکس، اردو بازار۔لاہور، ۱۹۸۹ء:ص۶۴، (ج) آل عمران:۱۱۹

۴۱۔ (الف) یونس:۳۲ (ب) قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ۔مؤلفہ پروفیسر محمد الیاس برنی۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت حضوری باغ روڈ۔ملتان، طبع دوم جنوری ۲۰۰۱ء:ص۱۰۲۳۔۱۰۲۴۔ ☆ بہ حوالہ خادم خاتم النبیین ﷺ۔ مصنفہ صدیق دیندار چن بسویشور:ص۵۸۔۶۸ (ج) التوبۃ:۲۰

۴۲۔ (الف) الفتح:۲۶ (ب) الفرقان:۵۹ (ج) التحریم:۸

۴۳۔ (الف) الاعراف:۱۵۷ (ب) النجم:۳۲ (ج) الانبیاء:۷۳

۴۴۔ (الف) الفتح:۱۴ (ب) علوم القرآن۔مولانا محمد تقی عثمانی۔ مکتبہ دار العلوم کراچی۔طبع ششم ۱۴۰۶ھ:ص۴۵۸۔تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباسؓ:صفحہ اول (ج) النساء:۱۵۷

۴۵۔ (الف) ھود:۴۶ (ب) السیرۃ۔شمارہ۲۰، رمضان المبارک ۲۰۰۸ء:ص۱۱۵،۱۲۲ (ج) البقرہ:۳۶

۴۶۔ (الف) ہود: ۴۶ (ب) الحاقۃ:۴۴،۴۷ (ج) یونس:۹۴

۴۷۔ (الف) یونس:۹۹ (ب) التحریم:۱ (ج) الاحزاب:۳۶

۴۸۔ (الف) الاعراف:۲۳ (ب) الانبیا:۸۷ (ج) آل عمران:۱۵۲

۴۹۔ (الف) آل عمران:۱۵۲،۱۵۵،۱۵۹ (ب) ایضاً:۱۵۹ (ج) الکہف:۲۸

۵۰۔ (الف) مجلّہ شش ماہی السیرۃ عالمی شمارہ۱۴، رمضان المبارک ۲۰۰۵ء۔ حواشی نمبر۳۳،۵۳،۵۴،۵۵، ۵۷،۶۲۔۶۳،۶۴،۶۶،۶۹،۷۳،۷۴،۷۶،۷۸،۱/۷۹،۹۹۔۱۰۰،۱۰۵:ص۲۳۰۔۲۷۲

(ب) آل عمران:۱۸۵ (ج) الزمر:۷۵

۵۱۔ (الف) آل عمران:۱۳۳ (ب) المومن:۷ (ج) البقرہ:۲۳۳

۵۲۔ (الف) البقرہ:۳۵ (ب) ایضاً (ج) النساء:۱۱

۵۳۔ (الف) یوسف:۴۴،۴۹ (ب) آل عمران:۴ (ج) حٰم السجدہ:۴۲

۵۴۔ (الف) المومن:۱۲ (ب) الانبیاء:۲۳ (ج) ابراہیم:۲۷

۵۵۔ (الف) النساء:۴۰ (ب) الزمر:۲۰ (ج) طٰہٰ:۵۲

۵۶۔ (الف) مریم:۶۴ (ب) الصافات:۱۸۰۔۱۸۲ (ج) الشوریٰ:۳۰

۵۷۔ (الف) الصّف:۲،۳ (ب) الزخرف:۳۳۔۳۵ (ج) آل عمران:۱۹۶

۵۸۔ (الف) البقرہ:۱۲۶ (ب) آل عمران:۱۳۹ (ج) الانعام:۱۴

۵۹۔ (الف) الانعام:۱۶۳ (ب) صحیح بخاری۔ باب غزوۃ موتہ من ارض الشام: ج ۲،ص ۶۱۱،
(ج) محمد بن محمد بن سلیمان المغربی المالکی۔ جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد۔ دار الکتب العلمیۃ بیروت (لبنان)، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۲۳ھ: ج ۲،ص ۹۲، حدیث رقم ۶۵۶۹، بہ حوالہ صحیحین

۶۰۔ (الف) المائدہ:۷۵ (ب) الانعام:۱۴۸:۱۴۹ (ج) النحل:۳۵

۶۱۔ (الف) الزمر:۱۰ (ب) آل عمران:۱۸۵ (ج) الرعد:۳۳

۶۲۔ (الف) الکہف:۶ (ب) الشعراء:۳ (ج) البقرہ:۲۷۲

۶۳۔ (الف) النحل:۳۷ (ب) القصص:۵۶ (ج) یونس:۴۳

۶۴۔ (الف) الزخرف:۴۰ (ب) صحیح مسلم: ج ۱،ص ۱۱۵ (ج) الزمر:۱۹

۶۵۔ (الف) التوبۃ:۱۱۳ (ب) ایضاً:۸۴ (ج) ایضاً:۸۰

۶۶۔ (الف) المنافقون:۶ (ب) التوبۃ:۱۰۸ (ج) بخاری: ج ۲،ص ۷۰۲☆مسلم: ج ۱،ص ۱۱۴

۶۷۔ (الف) الشوریٰ:۵۲ (ب) النحل:۹۹ (ج) ابراہیم:۲۲

۶۸۔ (الف) الاعراف:۱۸۸ (ب) بخاری: ج ۲،ص ۶۳۷ (ج) ایضاً: ج ۱،ص ۹۶

۶۹۔ (الف) ایضاً: ج ۲،ص ۸۴۳ (ب) مریم:۴ (ج) الحجر:۵۴۔ابراہیم:۳۹

۷۰۔ (الف) الجن:۲۱ (ب) مسند احمد: ج ۴،ص ۱۳۸☆ حاکم: ج ۴،ص ۲۱۴ (وافقہ الذھبی) (ج) البقرہ:۱۴۴

۷۱۔ (الف) النساء:۱۵ (ب) البقرہ:۶۷،۷۱ (ج) التوبہ:۳۱

۷۲۔ (الف) مسلم: ج ۲،ص ۳۵۰☆ نسائی: ج ۲،ص ۲۷۳ (ب) طٰہٰ:۷۱ (ج) التوبۃ:۱۲۸

۷۳۔ (الف) موطا امام مالک:ص ۷۸☆ ابن ماجہ:ص ۱۱۱☆ مسند احمد: ج ۴،ص ۲۸۸☆ طحاوی: ج ۱،ص ۲۹۵
(ب) المومن:۷۸ (ج) الانعام:۳۵

۷۴۔ (الف) بنی اسرائیل:۹۰،۹۳ (ب) الانعام:۱۰۹ (ج) الانعام:۵۷،۵۸
(د) البدایۃ والنہایۃ: ج ۴،ص ۳۶

۷۵۔ (الف) الاعراف:۱۵ (ب) المومن:۶۰ (ج) بخاری: ج ۲،ص ۷۰۶☆ مسلم: ج ۱،ص ۴۷۳

۷۶۔ (الف) الفرقان:۲ (ب) مسلم: ج ۲،ص ۳۳۵ (ج) انجیل یوحنا۔۳:۳۵ (د) ایضاً۔۵:۲۳

۷۷۔ (الف) مشکوۃ المصابیح: ج ۲،ص ۴۸۹ بہ حوالہ صحیحین (ب) المومن:۱۲ (ج) الانفال:۶۸

۷۸۔ (الف) التوبۃ:۸۴ (ب) آل عمران:۱۲۸ (ج) الانعام:۵۲

۷۹۔ (الف) التوبہ:۳۳ (ب) یونس:۱۵ (ج) الزخرف:۳۲

۸۰۔ (الف) الرعد:۲۶ (ب) النساء:۹ (ج) مشکوٰۃ المصابیح: ص۳۲

۸۱۔ (الف) الانعام:۵۰ (ب) التوبہ:۹۲ (ج) نسائی: ج۱،ص۲۷۶ ☆ ابوداؤد: ج۱،ص۳۲۹

۸۲۔ (الف) ھود:۳۱ (ب) مسلم: ج۲،ص۲۵۰ (ج) مستدرک حاکم: ج۴،ص۴۴۹ (وافقہ الذہبی)

۸۳۔ (الف) مسلم: ج۲،ص۲۵۰، حواشی (ب) مشکوٰۃ المصابیح: ج۱،ص۸۴

(ج) البدایۃ والنہایۃ: ج۵،ص۱۳۷ بحوالہ مسند امام احمد بن حنبل

۸۴۔ (الف) صحیح بخاری، باب فضل من ترک الفواحش (ب) التحریم:۱ (ج) مسلم: ج۱،ص۲۰۹

۸۵۔ (الف) النمل:۹۱ (ب) بخاری: ج۱،ص۷۴۴ ☆ مسلم: ج۱،ص۴۳۷ (ج) بخاری: ج۱،

ص۲۵۱ ☆ مسلم: ج۱،ص۴۴۲

۸۶۔ (الف) الاعراف:۱۵۷ (ب) التوبہ:۱۰۵ (ج) ایضاً:۹۴

۸۷۔ (الف) ایضاً:۷۴ (ب) ایضاً:۵۹ (ج) الاحزاب:۳۶

۸۸۔ (الف) الحشر:۷ (ب) التوبہ:۶۲ (ج) ابراہیم:۴

۸۹۔ (الف) طٰہٰ:۸۵ (ب) ایضاً:۹۷ (ج) الحج:۴

۹۰۔ (الف) المائدہ:۷۷ (ب) ابراہیم:۳۶ (ج) مجلہ ششماہی السیرۃ عالمی شمارہ ۲۲،

رمضان المبارک ۲۰۰۹ء،ص ۱۹۰ تا ۲۰۲

اسوۂ حسنہ کے ۱۰ مختلف پہلوؤں پر ایک جامع کتاب

عصری مسائل کے حوالے سے ایک قیمتی مطالعہ

پیغامِ سیرت

سید فضل الرحمن

صفحات: ۲۸۰ قیمت: ۲۲۰ روپے

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے-۴/۱۷، ناظم آباد نمبر ۴۔ کراچی۔ فون: 021-36684790